October 1997 • No. 251 • Rs. 8

صبر بامقصد انسان کا کردار ہے۔ بامقصد انسان اس کا
تحمل نہیں کر سکتا کہ وہ بے صبر اور بے برداشت ہو جائے
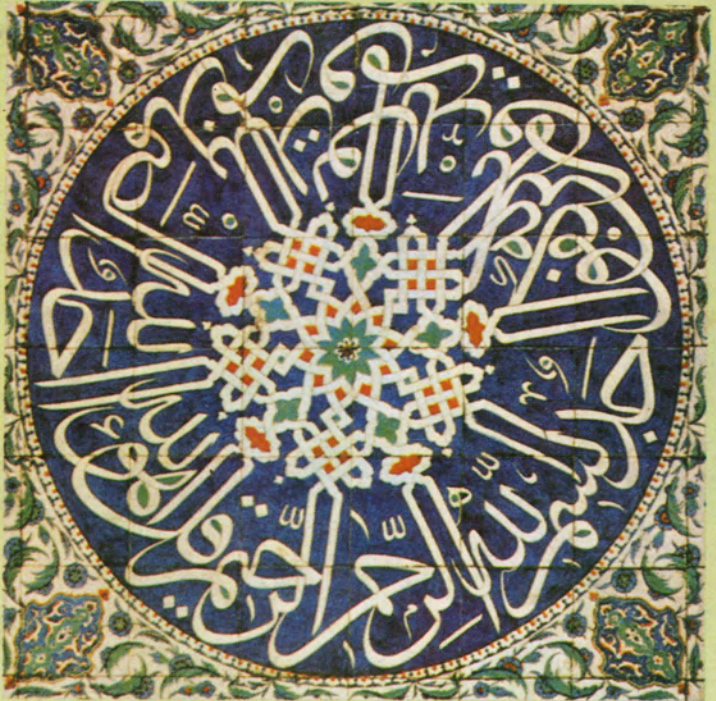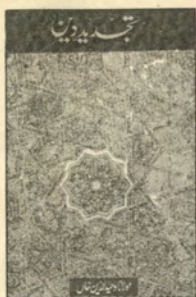
Size 22×14.5cm,
88 pages
Rs. 25
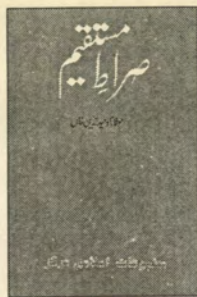
Size 22×14.5cm,
200 pages
Rs. 40
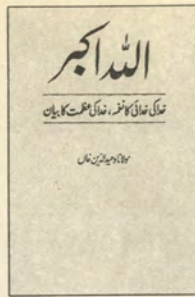
Size 22×14.5cm,
288 pages
Rs. 45

Size 22×14.5cm,
116 pages
Rs. 30
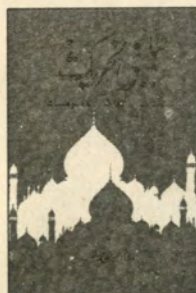
Size 22×14.5cm,
96 pages
Rs. 20
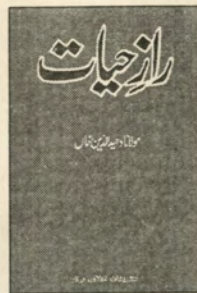
Size 22×14.5cm,
292 pages
Rs. 50
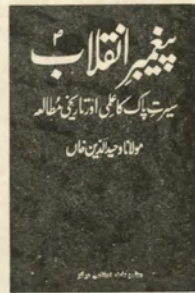
Size 22×14.5cm,
208 pages
Rs. 40
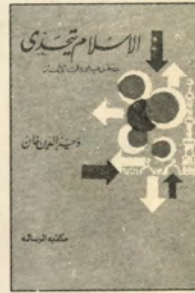
Size 22×14.5cm,
264 pages
Rs. 85
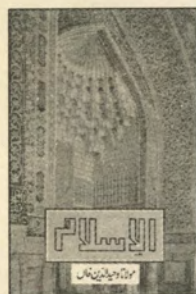
Size 22×14.5cm,
176 pages
Rs. 45
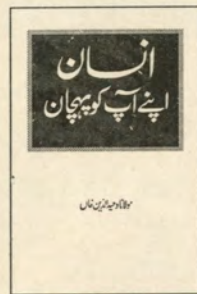
Size 22×14.5cm,
24 pages
Rs. 5
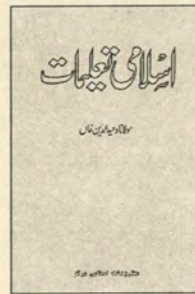
Size 22×14.5cm,
144 pages
Rs. 25
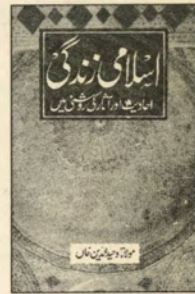
Size 22×14.5cm,
160 pages
Rs. 30

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اکتوبر ۱۹۹۷، شمارہ ۲۵۱

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, Near DESU,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs. 250. Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY
MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

خصوصی شمارہ
فلسطین نمبر — دوسری قسط

نئی کتابیں

مسلم اخباروں میں اکثر ایسی تصویریں چھپتی ہیں جن میں کچھ اسرائیلی سپاہی فلسطینی کو مارتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس تصویر کے اوپر یہ عنوان ہوتا ہے : اسرائیلی پولیس کی بربریت۔

لیکن اگر آپ دوسرے اخبارات کو دیکھیں تو یہی پولیس خود اسرائیلیوں کے خلاف ایسی ہی "بربریت" کرتی ہوئی نظر آئے گی۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیلی پولیس کی "بربریت" کسی فلسطینی پر محض فلسطینی ہونے کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ اس کے مخالفانہ رویہ کی بنا پر ہوتی ہے۔ جو فلسطینی صرف اپنے کام سے کام رکھنا چاہتے ہیں، وہ آج بھی اسرائیل میں پرامن طور پر رہ رہے ہیں۔ مگر جو فلسطینی سیاسی حریف بنتے ہیں یا تشدد کا فعل کرتے ہیں ان کے اوپر پولیس بھی کارروائی کرتی ہے۔ پولیس یہی کارروائی خود یہودیوں پر بھی اس وقت کرتی ہے جب کہ وہ سیاسی ہنگامہ کریں یا تشدد اور تخریب کاری کریں۔

موجودہ زمانہ میں مسلم صحافت نے ہر جگہ ایک مجرمانہ رول ادا کیا ہے۔ ہر سماج میں اور ہر زمانہ میں عُسر اور یُسر ساتھ ساتھ موجود رہتے ہیں۔ یعنی منفی واقعات بھی اور مثبت واقعات بھی۔ موجودہ زمانہ کے مسلم اخبارات نے یہ کیا کہ انھوں نے ہر جگہ صرف منفی پہلوؤں کی رپورٹنگ کی اور مثبت پہلوؤں کو سرے سے بیان ہی نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ کے مسلمان اپنے ملک اور اپنے سماج کے بارے میں منفی ذہنیت کا شکار ہو گئے۔ وہ یہ سمجھنے لگے کہ دنیا کی قومیں ان کی دشمن ہیں اور ان کے خلاف سازش کرنے میں مشغول ہیں۔ چنانچہ وہ تمام قوموں کے خلاف نفرت اور عداوت کی نفسیات میں مبتلا ہو گئے۔ اسی نفسیات کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر ملک میں، بشمول فلسطین مسلمانوں کے لیے بہترین مواقع موجود ہیں مگر وہ عین مواقع کے درمیان ان کو استعمال کرنے سے محروم ہیں۔

ایک مسلم دانشور جنھوں نے فلسطین کے مسئلہ پر کئی کتابیں لکھی ہیں، ان سے میں نے کہا کہ اسرائیلی حکومت لوگوں کو ویزا دینے میں بڑی فراخ دل ہے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے طنزیہ انداز میں جواب دیا : اس کا سبب تو واضح ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ لوگ زیادہ

سے زیادہ ان کے یہاں جائیں اور ان کی ترقیوں کو دیکھیں۔

اس کی ایک مثال ہندستان کے مشہور قانون داں مسٹر نانی پالکھی والا ہیں، انھوں نے اپنی اہلیہ کے ساتھ اسرائیل کا پانچ روزہ (۱۲-۱۶ جون ۱۹۹۴) دورہ کیا۔ اس سفر کے بعد مسٹر پالکھی والا نے ایک آرٹیکل لکھا جو نیوز فرام اسرائیل (News from Israel) کے شمارہ جولائی۔اگست ۱۹۹۴ میں شائع ہوا ہے۔ یہ پرچہ بمبئی میں واقع اسرائیلی قونصل (Consulate of Israel) کی طرف سے شائع کیا جاتا ہے۔ مسٹر پالکھی والا کے مذکورہ آرٹیکل کے کچھ اقتباسات علاحدہ صفحہ پر یہاں نقل کیے جارہے ہیں۔

اس آرٹیکل کو پڑھنے کے بعد میں نے ایک صاحب سے کہا کہ جو مسلمان اس طرح کی باتوں پر غصہ ہوتے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ مسلم ملکوں کو آمادہ کریں کہ وہ بھی اپنے یہاں ایسے واقعات رونما کریں جس کو لوگ آکر دیکھیں اور پھر واپس جاکر اس کی تعریف میں مضامین شائع کریں۔ جیسا کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تھا۔ اس وقت دنیا بھر کے لوگ بغداد اور قرطبہ اور غرناطہ کو دیکھنے کے لیے آتے تھے اور پھر واپس جاکر اپنے ہم وطنوں سے اس کا شاندار تذکرہ کرتے تھے۔

حدیث میں آیا ہے کہ خالفوا الیھود (یہود کے خلاف عمل کرو) اس کا مطلب اس سفر میں میری سمجھ میں آیا۔ یہاں "یہود" کا لفظ علامتی معنی میں ہے۔ یہ حدیث یہود کی گروہی مخالفت کے معنی میں نہیں ہے۔ وہ دراصل ظاہر پرستی والے دین کے خلاف ہے جو دورِ زوال میں یہود کے اندر بہت زیادہ آگئی تھی۔

حدیث میں ہے کہ یہود جوتا پہن کر نماز نہیں پڑھتے، اس لیے تم اس کے خلاف کرو۔ چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جوتا پہن کر نماز پڑھی (مشکاۃ المصابیح ۱/۲۳۸) اسی طرح آپؐ نے افطار میں تعجیل کرنے کی ہدایت فرمائی اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ یہودی افطار میں تاخیر کرتے ہیں (لأن الیھود یؤخرون) سنن ابی داؤد ۲/۳۱۵

اس کی حکمت یہ ہے کہ یہود کے یہاں دین کی داخلی روح ختم ہوگئی تھی، البتہ وہ ظواہر کا خوب اہتمام کرتے تھے۔ مثلاً ان کا کہنا تھا کہ جوتا اتار کر عبادت کرنا افضل ہے اور جوتا پہن کر عبادت کرنا غیر افضل۔ اسی طرح یہودی اس کو متقیانہ احتیاط بتاتے تھے کہ روزہ افطار کرنے میں

دیر کی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کی مخالفت کی بات دراصل اسی ظاہر پرستی کو توڑنے کے لیے فرمائی۔ آپ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ تم یہود کی طرح نہ ہو جاؤ جو ظواہر کے اہتمام کو دین سمجھتے ہیں۔ اس کے بجائے تم داخلی روح کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرو، کیونکہ وہی اصل مطلوب ہے۔

ابو عبیدہ بن الجراح کی قیادت میں شام فتح ہوا تھا۔ اس کے بعد ابو عبیدہ نے عمرو بن العاص کی سرداری میں ایک لشکر فلسطین بھیجا۔ یہاں اس وقت رومی (بازنطینی) سلطنت تھی۔ رومی لشکر کا سردار ارطبون تھا۔ مقابلہ میں رومی لشکر کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد وہ بیت المقدس (یروشلم) میں قلعہ بند ہو گیا۔ عمرو بن العاص نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ آخر کار وہ لوگ مجبور ہو گئے اور صلح کی پیش کش کی۔ البتہ یہ شرط رکھی کہ خلیفہ خود مدینہ سے یروشلم آئے۔

حضرت عمر فاروق مدینہ سے روانہ ہو کر جابیہ پہنچے۔ پھر وہاں سے یروشلم گئے۔ جزیہ کی ادائیگی پر مصالحت ہوئی، اس معاہدہ کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں آئی ہے۔ اس کی دفعات میں سے ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ان کے عبادت خانے ڈھائے نہیں جائیں گے اور نہ ان میں کوئی کمی کی جائے گی اور نہ ان کے دین کے معاملہ میں ان پر کوئی جبر کیا جائے گا (لا تهدم كنائسهم ولا ينتقص منها ولا يكرهون على دينهم)

حضرت عمر فاروق یروشلم کے کنیسۃ القیامہ میں داخل ہوئے۔ عصر کی نماز کا وقت آ گیا تو آپ نے نماز پڑھنا چاہا۔ پادری نے کہا کہ یہیں پڑھ لیجئے۔ مگر حضرت عمرؓ نے اندر نماز نہیں پڑھی۔ بلکہ باہر نکل کر چبوترہ پر اکیلے نماز پڑھی۔ یہ دیکھ کر پادری نے کہا کہ اگر آپ چرچ کے اندر نماز پڑھ لیتے تو مسلمان اس کو نظیر بنا لیتے اور کہتے کہ یہاں خلیفہ عمرؓ نے نماز پڑھی ہے۔

جنرل وایزمان اسرائیل کی کیبنٹ کا ایک منسٹر تھا۔ وہ مصر سے دوستی کی باتیں کرتا تھا۔ ایک صاحب نے اس کا قول عربی میں اس طرح نقل کیا کہ اعتماد باہمی مفاہمت کی کنجی ہے اور وہ تمام مشکلات کے حل کا راستہ ہے (الثقة هي مفتاح التفاهم والوصول الى حلول للمشاكل)

یہودیوں کا ایک گروہ اس کی "مصر دوستی" کی بنا پر اس سے ناراض تھا۔ ان لوگوں نے وایزمان کا لقب مسٹر ایجپٹ (Mr. Egypt) رکھ دیا تھا۔ اب اس کا تقابل مسلمان، خاص طور

پر برصغیر کے مسلمانوں سے کیجئے۔ سر سید نے انگریزوں سے مفاہمت کی بات کی تو یہاں کے مسلمانوں نے ان کو مسٹر انگلینڈ نہیں کہا، بلکہ ان کو انگریزوں کا نمک خوار اور دشمنوں کا ایجنٹ کہا۔ اسی طرح مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوؤں سے مفاہمت کی بات کی تو ان کو بھی مسٹر انڈیا کہنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ انھیں ہندوؤں کا ایجنٹ اور ملت فروش بتایا گیا، وغیرہ۔

یہ بھی شاید ایک پہلو ہے اس حدیث کا جس میں آپؐ نے یہ خبر دی کہ —— یہود بہتّر فرقوں میں بٹ گئے، اور تم ان سے بھی زیادہ فرقوں میں بٹ جاؤ گے۔

میری سمجھ میں آیا کہ ہر جگہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں جو تباہ کن جھگڑے پیدا ہوتے ہیں وہ صرف باہر والوں کی شرکت سے پیدا ہوتے ہیں۔ جھگڑا پیدا ہونے کے بعد اگر معاملہ صرف مقامی لوگوں تک محدود رہے تو دونوں فریق فطرت کی رہنمائی میں کام کرتے ہیں اور مل جل کر مسئلہ کو حل کر لیتے ہیں۔ مگر جب جھگڑا باہر کے "لیڈروں" کے ہاتھ میں چلا جائے تو بات بگڑ جاتی ہے۔ اور معمولی نزاع ناقابل حل مسئلہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

فلسطین کے مقامی مسئلہ کو سب سے پہلے اخوانیوں نے عالمی مسئلہ بنایا۔ ۱۹۴۸ میں شیخ حسن البنا نے جذباتی نعرے، تقریریں کرکے قاہرہ میں ایک لاکھ مصریوں کو جمع کیا اور قاہرہ کی سڑکوں پر لبیک یا فلسطین لگاتے ہوئے جلوس نکالا۔ یہ بیرونی دخل اندازی بڑھتی رہی۔ مگر اس کے نتیجہ میں عملاً جو ہوا وہ صرف یہ کہ ذلّت اور ناکامی میں ناقابل تلافی حد تک اضافہ ہو گیا۔

ترکی خلافت کے لیے ہندستان میں دھواں دھار تحریک چلانا، پاکستان کے لیے ان علاقوں میں ہنگامہ کھڑا کرنا جہاں پاکستان بننے والا نہ تھا۔ بابری مسجد کو اجودھیا کے دائرہ سے نکال کر سارے انڈیا بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کا مسئلہ بنانا۔ بوسنیا کے سوال کو مقامی مسلمانوں اور مقامی عیسائیوں سے بڑھا کر سارے عالم کے مسلمانوں کا سوال بنا دینا۔ یہ قیادت نہیں ہے بلکہ صرف نادانی ہے۔ اور اس نادانی نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

یروشلم میں ایک اسلامک آرٹ میوزیم ہے۔ اس میں ساتویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی تک کے "اسلامک آرٹ" رکھے ہوئے ہیں۔ اسی کے ساتھ اسلامی علوم کی ایک لائبریری بھی ہے جس میں قیمتی کتابیں جمع کی گئی ہیں۔

اس میں ایک قیمتی تصویر ہے۔ اس تصویر میں مغل حکمراں شاہ جہاں کو اپنے تخت پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ کو اوپر اٹھا کر خدا سے دعا کر رہا ہے۔ تصویر زبان حال سے کہہ رہی ہے ——— میں اگرچہ بادشاہ ہوں۔ مگر خدا کے آگے میں بھی عام انسانوں کی طرح ایک محتاج انسان ہوں۔

اسی طرح اس میں کلیلہ و دمنہ کا ایک فارسی نسخہ ہے۔ اس میں کلیلہ و دمنہ کے واقعات کو رنگین تصویروں کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ وغیرہ۔

کویت کے عربی ہفت روزہ المجتمع (۴ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ، یکم اگست ۱۹۹۵) میں المحامی خالد سیف (کردستان، العراق) کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس میں انھوں نے قبۃ الصخرۃ اور المسجد الاقصی کی تصویریں چھاپی ہیں۔ اور لکھا ہے کہ دونوں واضح طور پر الگ الگ عمارتیں ہیں۔ مگر ۸۰٪ فی صد مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں ایک ہیں اور جو قبۃ الصخرہ ہے وہی مسجد اقصیٰ ہے

(ان ۸۰٪ من المسلمین یعتقدون بان مسجد قبۃ الصخرۃ ھو المسجد الاقصیٰ)

عجیب بات یہ ہے کہ خود مذکورہ مضمون نگار نے بھی قبۃ الصخرہ کو "مسجد قبۃ الصخرۃ" لکھا ہے، حالاں کہ وہ سرے سے مسجد ہے ہی نہیں۔

انھوں نے لکھا ہے کہ جب بھی مسجد اقصیٰ یا فلسطین کا ذکر ہوتا ہے تو ذہن فوراً سنہری رنگ کے قبۃ الصخرہ کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلم دنیا کے ذرائع اعلام جب بھی فلسطین کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہمیشہ وہ قبۃ الصخرہ کی تصویر دکھاتے ہیں۔ حتیٰ کہ خود فلسطینی بھی اپنے جلسوں میں جو لوح لگاتے ہیں اس پر بھی قبۃ الصخرہ (بیت المقدس) کی تصویر بنی ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں فلسطین کے موضوع پر ایسی کتابیں چھپی ہیں جن کے ٹائٹل پر قبۃ الصخرہ (بیت المقدس) کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اور اس کے نیچے لکھا ہوا ہے: وا اقصاہ۔

مضمون نگار نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ایسا یہودی سازش کے تحت ہو رہا

ہے۔ عربی کا مثل ہے کہ آنکھ سے دور تو دل سے بھی دور (البعید عن العین بعید عن القلب) یہودی یہ چاہتے ہیں کہ مسجد اقصی کو مسلمانوں کی آنکھ سے دور کر دیں، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ان کے دل سے بھی دور ہو جائے گی۔ اور یہی یہودی جب اس کو ڈھائیں گے تو مسلمانوں کو خبر بھی نہیں ہوگی کہ مسجد اقصیٰ ڈھادی گئی ہے۔

اس قسم کی باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ یہ ۸۰ فی صد کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ مضمون نگار سمیت تمام ہی مسلمان اس مسئلہ کی حقیقی نوعیت سے بے خبر ہیں۔

یروشلم میں یہودیوں کی سب سے زیادہ مقدس چیز دیوار گریہ ہے، اور مسلمانوں کی سب سے زیادہ مقدس چیز مسجد اقصی۔ عجیب بات ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل متصل ہیں۔ ذیل کی تصویر مسجد اقصیٰ کا خارجی منظر پیش کرتی ہے۔ اوپر کے حصہ میں مسجد کا گنبد اور اس کی بلند دیوار ہے۔ اور نیچے اس سے بالکل ملی ہوئی دیوار گریہ ہے جس کا ایک جزو تصویر میں دکھائی دے رہا ہے۔
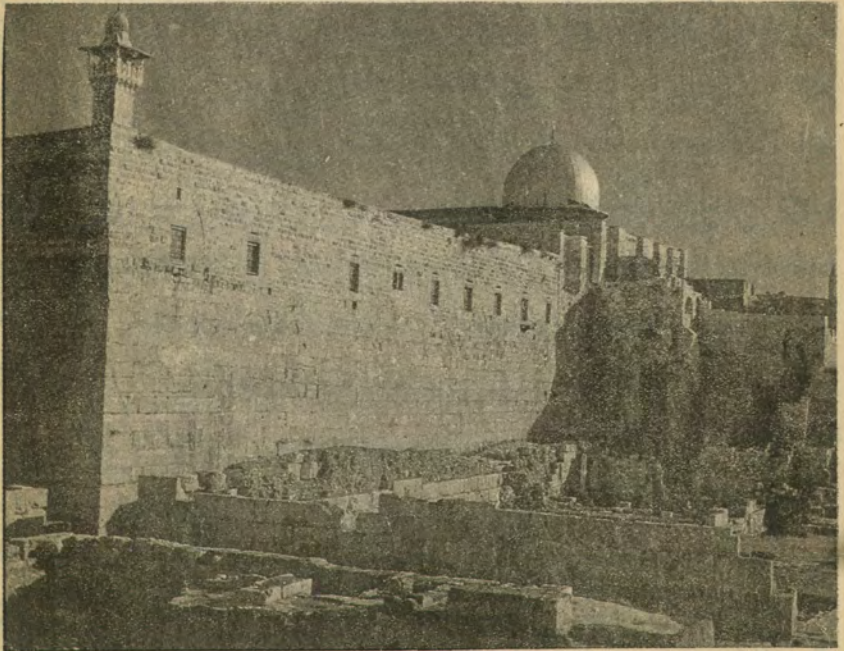
دیوارگریہ (Wailing Wall) کا دوسرا نام مغربی دیوار (Western Wall) ہے۔ رومیوں نے اس کو ۷۰ء میں تباہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس کی صرف ایک دیوار کا کچھ حصہ باقی رہ گیا تھا جو ابھی تک موجود ہے۔ اس سے ملی ہوئی اور اس کے اوپر وہ اونچی فصیل تعمیر کی گئی ہے جو مسجد اقصیٰ کا احاطہ کیے ہوئے ہے:

The wall now forms part of a larger wall that surrounds the Muslim Dome of the Rock and Al-Aqsa mosque. (EB/X/627)

اس دیوار کی لمبائی ۵۰ میٹر ہے اور وہ ۲۰ میٹر اونچی ہے۔ یہود کا عقیدہ ہے کہ خدا کی رحمت کبھی بھی مغربی دیوار سے جدا نہیں ہوتی۔ یہود بڑی تعداد میں یہاں دعا مانگنے کے لیے آتے ہیں۔
مصری لطیفہ بنانے میں بہت مشہور ہیں۔ انھوں نے ایک لطیفہ بنایا کہ امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر جب یروشلم گئے تو اس وقت کے اسرائیلی وزیر اعظم مناہم بیجن ان کو لے کر دیوارِ گریہ کے پاس گئے۔ یہودیوں کی نظر میں یہ ان کی سب سے زیادہ مقدس جگہ ہے۔ وہاں پہنچ کر جمی کارٹر نے دعا کی۔ انھوں نے اپنی دعا میں کہا کہ اے خدا! عربوں کو اور اسرائیل کو امن تک پہنچنے میں مدد دے۔ بیجن جو پاس ہی کھڑے تھے، انھوں نے فوراً کہا آمین۔ اس کے بعد جمی کارٹر نے کہا کہ خدایا! مصر کو اور اسرائیل کو پر امن طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی توفیق دے۔ بیجن نے کہا آمین۔ اس کے بعد جمی کارٹر نے کہا کہ خدایا! اسرائیلیوں کو بتا دے کہ وہ عربوں کو وہ تمام علاقے واپس کر دیں جن پر انھوں نے ۱۹۶۷ کی جنگ میں قبضہ کیا ہے۔ یہ سنتے ہی بیجن کا لہجہ بدل گیا۔ انھوں نے کہا کہ جنابِ صدر، میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آپ ایک دیوار سے بات کر رہے ہیں۔
یہ لطیفہ خود عربوں کا مرثیہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ۱۹۶۷ تک جو علاقے انھیں حاصل تھے، ان کو انھوں نے کیوں کر کھو دیا۔ یہ صرف اپنی پر جوش حماقت سے۔ مصر کی عرب قیادت نے اولاً سویز کو قبل از وقت قومی ملکیت میں لینے کا احمقانہ اقدام کر کے سارے یورپ کو اپنا مخالف بنا لیا۔ اس کے بعد صحرائے سینا سے اقوام متحدہ کے مشاہدین کو واپس کر کے اسرائیل کے لیے اقدام کے دروازے کھول دیے۔ اس طرح کی کچھ اور نادانیوں نے اسرائیل کو موقع

دیا کہ وہ یورپ کی مدد سے مصر پر حملہ کرے اور اس کی فوجی طاقت کو توڑ دے۔

اگر نااہل عرب قیادت احمقانہ غلطی نہ کرتی تو یہ علاقے تو اسے از خود حاصل تھے۔

مسلمان عام طور پر قدس کے مسئلہ کو قبلۂ اول کی بازیابی کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ مگر یہ بات کسی اعتبار سے بھی درست نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ۱۳ سال تک کعبہ کی طرف رخ کرکے عبادت کرتے رہے۔ اس لیے "قبلۂ اول" کا لفظ اگر کسی کے لیے بولا جا سکتا ہے تو وہ خود کعبہ ہے۔ ہجرت کے بعد تقریباً ۱۷ مہینہ تک آپ نے بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھی۔ اس کے بعد تحویل قبلہ کا حکم آیا اور ہمیشہ کے لیے کعبہ مسلمانوں کا قبلۂ عبادت بن گیا۔ اس تاریخ کے مطابق، بیت المقدس قبلۂ درمیانی ہے نہ کہ قبلۂ اول۔

دوسری اہم تر بات یہ ہے کہ قدس میں جو اصل اسلامی سبق ہے، وہ قومی یا سیاسی یا جغرافی نوعیت کا نہیں ہے۔ وہ ان جھگڑوں سے مکمل طور پر الگ ایک اور سبق ہے۔ اور وہ مدعو کی تالیفِ قلب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد بیت المقدس کو قبلہ کیوں بنایا۔ اس کی وجہ مسلّمہ طور پر یہود کی تالیف قلب تھی جو رسول اللہ ؐ کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کرکے مدینہ پہنچے تو آپ کے لیے دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ سابق کی طرح کعبہ کو قبلہ بنائیں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ مدینہ کے یہود کی پیروی کریں جو بیت المقدس کی طرف رخ کرکے عبادت کرتے تھے۔ آپؐ نے قدس کا انتخاب فرمایا، اس طمع میں کہ یہود آپ کی طرف مائل ہوں گے اور ایمان لائیں گے (فاختار القدس طمعاً فی ایمان الیہود واستمالتہم) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، ۲/۱۵۰

گویا قدس کا اصل سبق یہ ہے کہ مدعو کی رعایت یہاں تک کرو کہ ان کے قبلہ کو اپنا قبلہ بنا لو۔ آج اگرچہ ہمیں قبلہ بدلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم بہت سے دوسرے معاملات ہیں جن میں مدعو قوموں کی رعایت کرکے انھیں اسلام کے قریب لایا جا سکتا ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان اس سنّت رسول ؐ سے مکمل طور پر بے خبر ہیں، خواہ وہ فلسطین کے مسلمان ہوں یا دوسرے ملکوں کے مسلمان۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان غیر مسلم قوموں سے ہر جگہ رقابت قائم کیے

ہوئے ہیں۔ یہ قدس اسپرٹ کے سراسر خلاف ہے۔

ایک یہودی عالم جو اچھی عربی جانتا تھا۔ اس نے کہا کہ قدس کو ہم اپنا حق اس لیے کہتے ہیں کہ ہماری کتابوں ہی میں نہیں بلکہ خود آپ کی مقدس کتاب قرآن میں بھی اس کو ہمارا حق بتایا گیا ہے۔ جب کہ قرآن میں کہیں نہیں لکھا ہے کہ قدس مسلمانوں کو دے دیا گیا۔

اس نے کہا کہ آپ لوگ قدس کو قبلۂ اول کہتے ہیں مگر وہ قبلۂ اول کہاں ہے وہ تو قبلۂ عارضی تھا۔ آپ کے پیغمبر پہلے کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے تھے۔ پھر وقتی طور پر کچھ دنوں بیت المقدس کو قبلہ بنایا اور اس کے بعد پھر کعبہ کو قبلہ بنا لیا۔ آپ کے عقیدہ کے مطابق، آپ کے پیغمبر نے یروشلم آکر یہاں نماز پڑھی۔ اس وقت یہاں غیر مسلموں کی سیاسی حکومت قائم تھی۔ آپ بھی ہماری سیاسی حکمرانی کے تحت یہاں آکر نماز پڑھیے۔ ہم آپ کو نہیں روکتے۔

میں نے جواب دیا کہ اس مسئلہ پر مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان سنجیدہ انداز میں ڈائیلاگ ہونا چاہیے۔

پاکستان میں اگر آپ جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہاں ہر چیز کو اسلامائز کر لیا گیا ہے۔ حتی کہ ایک فلم کمپنی اپنی کسی فلم کو ریلیز کرنے والی ہوگی تو اس کا اشتہار ان الفاظ میں شائع کیا جائے گا —— " اِن شاء اللّٰہ، اگلے جمعہ کو ہماری نئی فلم ریلیز کی جائے گی "۔

یہی معاملہ اسرائیل کا ہے۔ وہاں ہر چیز کو یہودی رنگ میں رنگ دیا گیا ہے۔ مثلاً یروشلم کی ایک جدید کالونی کا نام قریۂ داؤد (David's Village) ہے۔ ایک اور کالونی کا اشتہار میں نے دیکھا۔ اس کے اوپر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا کہ ارض موعود میں آپ کا اپارٹمنٹ :

Your own apartment in the promised land

ایک اخبار میں ایک اسرائیلی کمپنی کا اشتہار دیکھا۔ جس کا کام تل ابیب میں نجی جائدادوں کا انتظام (property management) کرنا ہے۔ اشتہار میں گھر کی دیکھ بھال اور اس کے انتظام کے سلسلہ میں جن باتوں کا ذکر تھا، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ —— اور ہم حفاظت کا انتظام کرتے ہیں :

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسرائیل میں کس طرح عام لوگ غیر محفوظ حالت میں زندگی گزارتے ہیں۔
یہودی جانتے ہیں کہ وہ صرف اسرائیل (فلسطین) کے اوپر زندہ نہیں رہ سکتے۔ انھیں ساری دنیا سے اپنی زندگی کی خوراک حاصل کرنا ہے۔ ایک یہودی تاجر نے کہا —— عالمی تجارت ہمارا مستقبل ہے :

Global business is our future.

قدیم زمانہ میں کوئی ملک زیادہ تر اپنے مقامی ذرائع پر انحصار کرتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں جدید کمیونی کیشن کے ظہور میں آنے کے بعد صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔ آج یہ ممکن ہوگیا ہے کہ آپ ایک چھوٹے سے خطۂ زمین پر بیٹھ کر ساری دنیا میں اپنے کاروبار کو پھیلائیں، اور ساری دنیا سے اپنے لیے رزق کا سامان حاصل کریں۔

ادارے چلانے کا روایتی طریقہ یہ ہے کہ اس کے ممبران کی ایک جگہ میٹنگ ہو۔ اس میں تبادلۂ خیال کے بعد زیر بحث مسئلہ میں کوئی بات طے کی جائے اور پھر اس پر عمل درآمد کیا جائے۔ اب یہ طریقہ دیر طلب قرار پا چکا ہے۔

یہودیوں نے موجودہ زمانہ میں ایسے عالمی ادارے قائم کیے ہیں جس کے ممبر صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو نہایت باشعور ہوں۔ یہ لوگ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر دوری کے باوجود ان کے اجتماعی فیصلہ میں ایک یا دو دن سے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ یہ معجزہ جدید کمیونی کیشن کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔

مثلاً عالمی پریس میں ایک چیز چھپتی ہے جو یہودی مفاد سے ٹکراتی ہے۔ اب یہ ادارہ یہ کرتا ہے کہ فوراً بذریعہ فیکس اس کی نقل تمام ممبروں کے نام ساری دنیا میں بھیج دیتا ہے۔ یہ لوگ اپنے تبصرے دوبارہ فوری طور پر بذریعہ فیکس ادارے کو بھیج دیتے ہیں۔ اب یہ تمام کاغذات ایک اکسپرٹ شخص کو پہنچا دیے جاتے ہیں۔ وہ ان کا مطالعہ کرکے فوری طور پر اپنا تحریری ردعمل ادارہ کو دے دیتا ہے۔ ادارہ اس تحریر کو دوبارہ تمام ممبران کے نام فیکس کر دیتا ہے۔ چند گھنٹوں میں تمام ممبران کی رائیں دوبارہ بذریعہ فیکس ادارہ کے صدر دفتر میں وصول ہو جاتی ہیں۔ ان کو

سامنے رکھ کر مذکورہ اکسپرٹ اپنی تحریر کو دوبارہ تیار کرتا ہے۔ وہ فوراً ہی عالمی پریس کے نام روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح صرف ایک یا دو دن میں یہودی نقطۂ نظر عالمی پریس میں آجاتا ہے۔

میری تمنا ہے کہ میں بھی دعوتی مقصد کے تحت اس قسم کا ایک انٹرنیشنل ادارہ قائم کروں۔ یہ ادارہ جدید کمیونی کیشن کو استعمال کرکے اِن شاءاللہ عالمی اسٹیج پر دعوت کی منصوبہ بندی کرے گا اور اس سلسلہ کے ضروری کام انجام دے گا۔ اور یہ سب کچھ رسمی میٹنگ کے بجائے ٹیلی فون، فیکس، انٹرنٹ کے ذریعہ انجام پائے گا۔ وماذلك على الله بعزيز۔

یروشلم میں مخصوص انداز کی ایک یادگار تعمیر کی گئی ہے۔ اس کا انگریزی نام (Homage to Jerusalem) ہے۔ اس کو تین مذہبوں کا یروشلم کہا جاتا ہے:

Jerusalem: The Three Religions

اس میں تینوں سامی مذہب کے علامتی تقدس بنائے گئے ہیں۔ ان کو بتاتے ہوئے ایک یہودی نے کہا:

It represents elements that Judaism, Islam and Christianity have in common.

ایک صاحب سے مھدی سوڈانی کا تذکرہ ہوا۔ انھوں نے کہا کہ مھدی سوڈانی نے اگرچہ عوام کی بھیڑ اپنے گرد اکھٹا کر لی تھی۔ مگر وہ کوئی معتدل آدمی نہیں تھے۔ انھوں نے بتایا کہ مصر کے حکمراں محمد علی پاشا نے ۱۸۳۵ میں سوڈان پر حملہ کیا تھا۔ مھدی سوڈانی کو اس کی خبر ملی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ دریائے نیل کے راستہ سے سوڈان پہنچنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مریدوں کی مجلس میں کہا کہ وہ دریائی راستہ سے سوڈان پہنچنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ کیوں کہ خدا کی قسم، میں دریا کا سارا پانی پی کر اس کو خشک کر دوں گا (تاالله اشرب البحر۔۔)

فلسطین (اسرائیل) کا ایک شہر حیفہ ہے۔ یہاں پانچ مذہب کے لوگ رہتے ہیں اور ہر ایک کی عبادت گاہیں اور مذہبی ادارے وہاں موجود ہیں ——— یہودی، مسلمان، عیسائی، دروزی اور بہائی۔ عرب مسلمانوں کی تعداد ۱۰ فی صد سے کچھ اوپر ہے۔ ایک یہودی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آپ دیکھئے، یہ سب لوگ کس طرح رواداری کے ساتھ یہاں رہ رہے ہیں:

...they share a unique spirit of tolerance.

بہائی فرقہ دنیا میں پانچ ملین ہے۔ حیفہ میں ماونٹ کارمل کے اوپر اس کا مرکز ہے جس کا سنہرا گنبد دور سے دکھائی دیتا ہے۔ بہائی مذہب ایران میں ۱۸۴۴ میں وضع کیا گیا۔ اس کے بانی کا نام باب اللہ تھا۔ حکومت ایران سے ان کا اختلاف ہوا۔ حکومت نے ان کے ۲۰ ہزار آدمیوں کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد اس مذہب کو ماننے والے دنیا کے مختلف ملکوں میں پھیل گئے۔ اسرائیل کے قیام کے بعد ۱۹۴۸ میں انھوں نے یہاں اپنا مرکزی دفتر قائم کیا۔ ۱۹۵۳ میں موجودہ عمارت بن کر مکمل ہوئی۔ ایک بہائی نے کہا:

Our relations with the Israelis are proper and friendly.

اسرائیل میں بہائیوں کی تعداد ایک سو سے کچھ زیادہ ہے۔ تاہم ان کے افراد بڑی تعداد میں یہاں "زیارت" کے لیے آتے رہتے ہیں۔ بہائی اپنے مذہب کو یونیورسل مذہب کہتے ہیں۔ ان کے یہاں شادی بیاہ پر کوئی پابندی نہیں۔ وہ وحدتِ ادیان کی وکالت کرتے ہیں۔ ایک بہائی نے کہا:

It doesn't matter what you believe, the scientific fact is that we are all brothers inhabiting the same world. We believe that all religions have validity and we accept them.

اسرائیل کے زمانۂ قیام میں کئی بار میں نے دیکھا کہ یہودی کس طرح یہاں ایک شاندار زندگی گزار رہے ہیں۔ "کیا یہ وہی لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے" میں نے سوچا۔ میری سمجھ میں آیا کہ لعنت کا کوئی لازمی تعلق خوش حالی یا بدحالی سے نہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ کوئی فرد یا قوم خدا کے نزدیک لعنت زدہ ہو مگر موجودہ دنیا میں وقتی طور پر وہ شاندار قسم کی مادی زندگی حاصل کر لے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ملعون ہونے کا مطلب رحمتِ الٰہی سے محروم ہونا ہے۔ جن فرد یا گروہ پر خدا کی لعنت ہو وہ بے حسی کا شکار ہو جائے گا۔ خدا کی نظر میں اس کا ہر عمل بے قیمت ہو جائے گا، خواہ بظاہر وہ کوئی درست عمل کیوں نہ دکھائی دیتا ہو۔

یہودی نفسیات فخر کی نفسیات ہے۔ ان کی ہر بات میں فخر کا احساس جھلکتا ہے۔

یہودی میوزیم (Diaspora) کے ناظم نے اپنے ادارہ کا تعارف کرتے ہوئے پر فخر طور پر کہا کہ دلائی لاماتک اسرائیل آئے تاکہ یہ دیکھیں کہ یہودیوں نے وہ کون سا طریقہ نکالا جس کے ذریعہ وہ اتنی لمبی مدت تک اپنی قومی شناخت کو برقرار رکھ سکیں :

Even the Dalai Lama visited Israel to see what technique the Jews developed to survive and maintain their identity.

میں خود اریحا (Jericho) نہ جا سکا۔ایک کرسچین سیاح جو اریحا (مسلم علاقہ) میں گیا تھا۔اس نے کہا کہ میں سمجھتا تھا کہ سرحد پر زبردست پہرہ ہوگا۔لیکن مجھے تعجب ہوا جب میں نے دیکھا کہ وہاں ایک گارڈ ہے جس کو ہماری جانچ سے کوئی دل چسپی نہیں۔اس نے شلوم کہہ کر ہمارا استقبال کیا :

Expecting the border to be heavily guarded, I was surprised to see a disinterested guard, who upon seeing us welcomed us with a shalom.

فلسطین کا ایک حصہ صحرا ہے۔یہ صحرا ہزاروں سال سے یوں ہی پڑا ہوا تھا موجودہ زمانہ میں یہ معلوم ہوا کہ پانی سے محرومی کسی زمین کو ریگستان بناتی ہے۔اگر پانی فراہم کیا جا سکے تو ریگستان کو سرسبز علاقہ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔یہودی نے اس نئی دریافت سے فائدہ اٹھایا اور فلسطین کے صحرائی علاقہ کے بڑے حصہ کو کھیت اور باغ میں تبدیل کر دیا۔ایک اسرائیلی نے اپنے مضمون میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فخر کے ساتھ لکھا تھا کہ ہم نے ڈرپ آبپاشی کے طریقہ کو ترقی دے کر ریگستان کو سرسبز و شاداب بنا دیا :

That a country can be transformed from barren desert to a lush wonderland, can be attributed to the miracle of drip irrigation.

ایک سیاح جس نے فلسطین کے صحرائی علاقہ کو دیکھا تھا۔اس نے کہا کہ ہم یہاں آئے تھے کہ صحرا کو دیکھیں گے مگر یہاں ہمیں سبزہ دیکھنے کو ملا :

We had come here to see desert, but, instead, we found greenery.

یہاں ایک ہوٹل الحمرا ریستوراں (Alhambra Restaurant) کے نام سے ہے۔وہ جافا

اور تل ابیب اور یروشلم میں قائم ہے۔ میں اس نام کا سبب معلوم نہ کر سکا۔ تاہم اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فلسطین (اسرائیل) پر مسلم تہذیب کا اثر کتنا زیادہ ہے۔

اسرائیل اور اردن کے درمیان ایک انوکھی جھیل ہے جس کو البحر المیت (Dead Sea) کہتے ہیں۔ وہ سطح سمندر سے ۴۰۱ میٹر نشیب میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۴۰۵ مربع میل ہے۔ اس کے پانی میں نمک اور معدنیات کی آمیزش عام سمندروں سے چار گنا زیادہ ہے۔ حتیٰ کہ آدمی اس کے اندر داخل ہو تو وہ غرق نہیں ہوتا۔ رومی حکمراں وسپاسین (Vespasian) ۶۸-۶۶ء میں فاتحانہ طور پر فلسطین میں داخل ہوا۔ اس کو بتایا گیا کہ بحر مردار کا پانی اتنا گاڑھا ہے کہ اس میں داخل ہونے والا آدمی اوپر ہی اوپر تیرتا رہتا ہے، اس نے تجربہ کے لیے کچھ یہودی قیدیوں کو اس کے اندر پھنکوا دیا:

When the Roman Emperor Vespaṣian heard of this, he had some Jewish prisoners thrown into the water to see if they could float.

جغرافیہ کے علما، بحر مردار جیسی انوکھی جھیل (سمندر) کو سطح زمین کی قدیم تبدیلیوں کے عہد (holocene epoch) کی ایک یادگار سمجھتے ہیں۔ مگر وہ یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ تبدیلیوں کے اس دور میں، جو کہ پچھلے دس ہزار سال کی ارضی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے، اس میں صرف بحر مردار ہی استثنائی طور پر ایسی وسیع جھیل کی صورت میں کیوں تبدیل ہو گیا۔ جب کہ اس کا بھی ثبوت ملا ہے کہ ایک عرصہ پہلے تک وہ عام جھیل کی مانند تھا۔

اصل یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں یہاں قوم لوط آباد تھی۔ اس کے اندر برائیاں پیدا ہوئیں تو حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام ان کی اصلاح کے لیے بھیجے گئے۔ مگر قوم سرکش ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ دو ہزار سال قبل مسیح میں ایک شدید زلزلہ آیا۔ زمین کے اندرونی آتش گیر اجزا بھڑک کر جل اٹھے۔ پورا علاقہ تباہ ہو کر رہ گیا۔

ہندستان ٹائمس (۱۸ ستمبر) کے درمیانی صفحہ پر مسٹر این سی منن (مقیم واشنگٹن) کا مضمون فلسطین کے مسئلہ پر تھا۔ اس کا عنوان تھا —— اور امن کا وقت:

And a time of peace

مضمون نگار ۱۳ ستمبر ۱۹۹۳ کو واشنگٹن (وہائٹ ہاوس) کی اس تقریب میں موجود تھے جہاں فلسطینی لیڈر یاسر عرفات اور اسرائیلی وزیر اعظم یتزک رابن کے درمیان ایک دوسرے کو تسلیم کرنے کا معاہدہ ہوا۔ مضمون نگار نے اس معاہدہ امن کو بے نظیر مفاہمت (unprecedented accommodation) سے تعبیر کیا ہے۔

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ اس قسم کا نسبتاً کم اہم معاہدہ ۱۹۷۹ میں سابق مصری صدر انور السادات اور سابق اسرائیلی وزیر اعظم مناہم بیجن کے درمیان ہوا تھا۔ اس وقت یاسر عرفات نے انور سادات کو غدّار (traitor) بتایا تھا اور کہا تھا کہ وہ اس قابل ہیں کہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ مگر آج خود یاسر عرفات، سادات کی اسی سنّت پر زیادہ بڑے پیمانہ پر عمل کر رہے ہیں۔

یاسر عرفات اب اگر امن کی پالیسی کو ضروری سمجھتے ہیں تو ان کے لیے اپنی اس رائے پر عمل کرنا کوئی غلط بات نہیں۔ مگر ایسی صورت میں انھیں یہ اعلان بھی کرنا چاہیے کہ اس سے پہلے انھوں نے فلسطین کے بارہ میں جو پالیسی اختیار کی وہ درست نہ تھی۔ اور انور السادات کو برا بتانا بھی ایک سنگین غلطی تھی۔ غلطی کا اعتراف نہ کرنا ان کے لیے خود سب سے بڑی غلطی ہوگی۔

ابن عساکر (۶۰۰ - ۵۲۷ ھ) مشہور محدث اور مورخ ہیں۔ انھوں نے مسجد اقصیٰ کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کا نام ہے: الجامع المستقصی فی فضائل المسجد الاقصیٰ۔ یہ غالباً اس موضوع پر سب سے زیادہ جامع کتاب ہے۔

قبطی چرچ کے پوپ نے ۴ جولائی ۱۹۹۵ کو ایک بیان میں کہا کہ یہودی اب شعب مختار (Chosen people) کی حیثیت نہیں رکھتے۔ مسیحیت کے ظہور کے بعد اب ان کی یہ حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ میں نے ایک عیسائی اسکالر سے کہا کہ یہ بات جزئی طور پر صحیح ہے۔ کیونکہ پیغمبر اسلام کے ظہور کے بعد خود مسیحیت کی حیثیت بھی ختم ہو چکی۔ اور اب خدا کا مختار گروہ وہ ہے جو دینِ محمدی کو اختیار کرے۔ اس نے توجہ کے ساتھ میری بات سنی اور پھر کہا: مگر کیا محمد عربی ایک عالمی پیغمبر تھے۔

ایک صاحب سے جہاد (بمعنی قتال) کے موضوع پر گفت گو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کا کہنا ہے کہ اسلام میں جہاد صرف دفاع کے لیے ہوتا ہے۔ مگر دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

ماہرینِ جنگ کا تو کہنا ہے کہ اقدام خود بہترین دفاع ہے :

Offence is the best defence.

میں نے کہا کہ آپ لوگوں کو صرف پرانے زمانہ کی باتیں معلوم ہیں۔ نئے زمانہ کی آپ کو کچھ خبر نہیں۔ یہ سب مقولے اس زمانہ کے ہیں جب کہ جنگ صرف دو فوجوں کے درمیان ہوتی تھی۔ عام شہری اس کے نقصان سے بچے رہتے تھے۔ مگر آج کی جنگ پورے ملک میں تباہی برپا کرتی ہے۔ اب نہ اقدامی جنگ کا کوئی نتیجہ ہے اور نہ دفاعی جنگ کا۔ اب تو صرف تدبیر کا راستہ انسان کے لیے باقی رہ جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ انٹرنیشنل فیڈریشن آف ریڈ کراس اینڈ ریڈ کریسنٹ سوسائٹیز نے جنیوا سے اس سلسلہ میں ایک جائزہ (World Disasters Report 1995) چھاپی ہے۔ اس کے مطابق، دوسری عالمی جنگ کے بعد ۵۶ جنگوں میں جو لوگ شدید طور پر اس سے متاثر ہوئے ان میں ۹۵ فی صد تعداد غیر فوجی شہریوں سے تعلق رکھتی تھی :

Ninety-five percent of the victims were civilians.

ایسی حالت میں جنگ دوطرفہ تباہی کے ہم معنی بن کر رہ گئی ہے۔

اگست ۱۹۶۹ میں یروشلم کی مسجد اقصی میں آتش زدگی کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد ساری دنیا میں مسلمانوں کی طرف سے اس کے خلاف احتجاج کیا گیا۔

۲۹ اگست کی شام کو دہلی کے آسمان نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ یہ مسلمانوں کے دو جلسے تھے جو ایک ہی تاریخ کو ایک ہی مقصد کے تحت مگر دو الگ الگ شامیانوں کے نیچے کیے گئے۔ دونوں کا مقام جامع مسجد دہلی کے قریب کا آزاد پارک تھا۔ ایک جلسہ شام کو ۵ بجے ہوا اور دوسرا ساڑھے نو بجے شب میں۔

دونوں جلسوں کا مقصد ایک تھا۔ مسجد اقصی کی آتش زدگی کے خلاف یوم احتجاج منانا۔ دونوں جلسوں میں اپنے اپنے حلقہ کے لوگ اکھٹا ہوئے۔ میں دونوں ہی میں شریک تھا۔ میں نے سنا کہ دونوں جلسوں میں اسرائیل کے خلاف پرجوش تقریریں ہو رہی ہیں۔ ان تقریروں کا خلاصہ یہ تھا کہ —— اے عربو! متحد ہو کر اسرائیل کا مقابلہ کرو۔

آخری جلسہ سے فارغ ہو کر جب میں رات کے وقت اپنی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوا تھا تو میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری تھے اور زبان سے یہ الفاظ نکل رہے تھے : ہم متحد ہو کر مشورہ بھی نہیں دے سکتے، اور وہ متحد ہو کر مقابلہ کریں (الجمعیۃ ویکلی ۱۲ ستمبر ۱۹۶۹)

حال میں فلسطین کی سیاسی جدوجہد کے بارے میں ایک کتاب ایک برطانی مصنف نے شائع کی ہے۔ اس انگریزی کتاب کے مصنف کا نام گراہم اشر ہے :

Palestine in Crises: The Struggle for Peace and Political Independence,
by Graham Usher

یہ کتاب ان فلسطینیوں یا ان عربوں میں پسند کی جا رہی ہے جو یاسر عرفات کی کوششوں سے زیادہ اتفاق نہیں کرتے۔ اس کتاب میں برطانی مصنف نے لکھا ہے کہ یاسر عرفات کی پالیسیوں کے نتیجہ میں فلسطین کو جو امن حاصل ہوا ہے، وہ وقتی اور مصنوعی ہے۔ اور وہ امریکہ اور اسرائیل کی شرطوں پر قائم ہوا ہے نہ کہ عربوں کی شرطوں پر۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ گراہم اشر کی یہ بات کوئی زیادہ اہم بات نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے جو معاہدہ کیا تھا وہ بھی وقتی تھا اور وہ تمام تر فریق مخالف کی شرطوں پر کیا گیا تھا۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے وہ مسلمانوں کے حق میں فتح مبین بن گیا۔ اصل یہ ہے کہ یہ دنیا مقابلہ کی جگہ ہے یہاں اصل اہمیت صلح کی دفعات کی نہیں ہے۔ بلکہ اصل اہمیت یہ ہے کہ صلح کے بعد مستقبل کی تعمیر کے لیے آپ کتنی اہلیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ کسی بھی صلح کو مستقبل کے نتائج کے اعتبار سے دیکھنا چاہیے نہ کہ حال کی لفظی دفعات کے اعتبار سے۔ میں نے کہا کہ الفاظ ہمیشہ تاریخ کے تابع ہوتے ہیں، تاریخ کبھی الفاظ کے تابع نہیں ہوتی۔

مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگ ساری دنیا میں یہ غلطی کر رہے ہیں کہ وہ اپنے مسائل کو قول سدید (الاحزاب ۷۰) کی زبان میں پیش نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ ان کو جذباتی بلکہ غیر واقعی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی بھی ملی یا قومی مسئلہ میں مسلمانوں کے درمیان حقیقت پسند رائے نہیں بنتی۔ ساری دنیا کے مسلمان ذہنی اعتبار سے غیر واقعی دنیا میں جیتے ہیں۔ اور جو لوگ غیر واقعی فضا میں جیتے ہوں وہ کبھی اپنے معاملات کی صحیح منصوبہ بندی نہیں کر سکتے۔

فلسطین کا مسئلہ بھی اسی ذہنیت کا شکار ہوا ہے۔ اس کی ایک علامتی مثال نیچے کی تصویر میں دیکھی جا سکتی ہے۔

کویت سے ایک عربی ہفتہ وار نکلتا ہے جس کا نام المجتمع ہے۔ اس کو جمعیۃ الاصلاح الاجتماعی نے ۱۹۷۰ میں جاری کیا تھا۔ اس کے شمارہ ۳۰ مئی ۱۹۹۵ کے صفحہ اول پر ایک نمایاں تصویر شائع کی گئی ہے۔ یہ بیت المقدس کی تصویر ہے۔ اس کے ایک طرف اسرائیلی جھنڈا گڑا ہوا ہے، اور دوسری طرف ایک اسرائیلی فوجی گن لٹکائے ہوئے کھڑا ہے۔ یہ تصویر واضح طور پر مصنوعی ہے۔ جھنڈا اور فوجی کی تصویر الگ سے کاٹ کر یہاں چپکائی گئی ہے۔ بیت المقدس کے پاس ایسی کوئی چیز حقیقۃً موجود نہیں۔

عربی اخبارات و رسائل میں مسلسل "القدس" کے بارے میں مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مگر وہ زیادہ تر جذباتی انداز میں لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ بظاہر ایسا محسوس
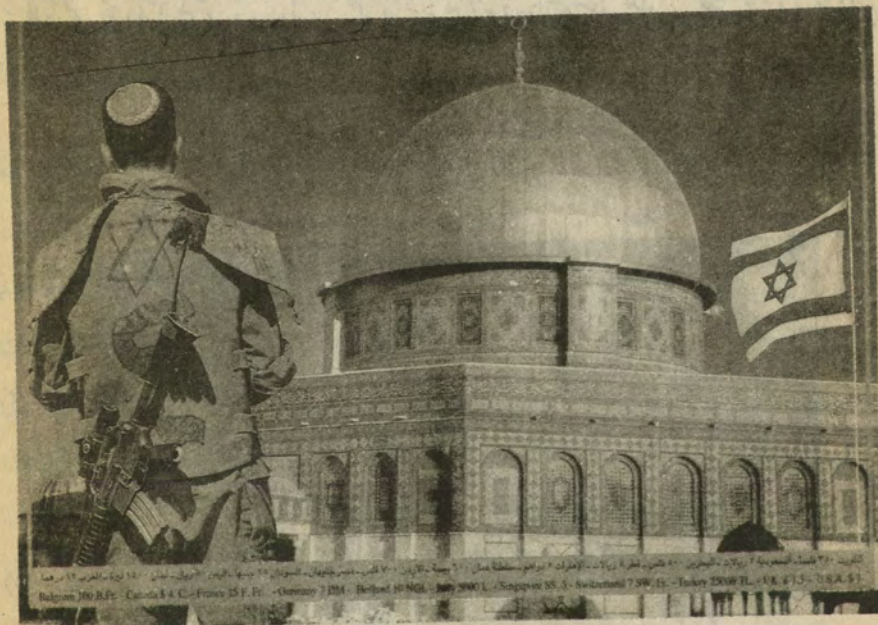
ہوتا ہے کہ ان لکھنے والوں کو قدس کے حقیقی مسئلہ کی خبر نہیں۔ مثال کے طور پر مکہ سے نکلنے
والے ماہنامہ الرابطۃ کے شمارہ ۳،۳ میں ایک مضمون چھپا ہے جس کا عنوان ہے حول قضیۃ
القدس۔ یعنی بیت المقدس کے مسئلہ کے بارہ میں۔ اس مضمون کے ساتھ ایک تصو نمایاں طور
پر چھاپی گئی ہے جو یہاں نقل کی جاتی ہے۔ یہ تصویر واضح طور پر قبۃ الصخرۃ کی ہے مگر س کے
نیچے لکھا ہوا ہے : مسجد اقصیٰ کو عرب سیادت کے تحت واپس لانا بالکل صر ہے۔

جب میں دہلی سے یروشلم کے لیے روانہ ہوا تو میرے ذہن میں ب المقدس اور مسجد اقصیٰ
کی واضح تصویر نہ تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید دونوں ایک ہی ہیں۔ چنانچہ اں کی کانفرنس میں پیش
کرنے کے لیے میں نے جو پیپر تیار کیا اس میں بھی میں نے مسجد اقصیٰ لکھ کر کے آگے بریکٹ میں
بیت المقدس لکھ دیا تھا۔ گویا کہ دونوں ایک ہی ہیں۔

یہ غلط فہمی کوئی انفرادی نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ۹۹ فی صد مسلمان اس معاملہ میں اسی قسم کی
غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ دونوں کے بارے میں کوئی واضح شعور نہیں رکھتے۔ حتیٰ کہ یہ غلط فہمی
بہت پہلے سے چلی آرہی ہے۔

صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ اس امت کا معاملہ مستقیم رہے گا یہاں تک کہ

■ لابد ان يعود الأقصى للسيادة العربية ■

قیامت آجائے۔ دوسری کتب حدیث میں بھی یہ روایت الفاظ کے فرق کے ساتھ آئی ہے۔ الاوسط للطبرانی میں یہ الفاظ ہیں: یقاتلون علی ابواب بیت المقدس وما حوله لا یضرهم من خذلهم ظاهرین الی یوم القیامة (فتح الباری ۱۳/۳۰۸) یعنی امت کے یہ اہل حق بیت المقدس کے دروازوں پر اور اس کے آس پاس قتال کریں گے۔ ان کا کوئی حریف انھیں نقصان نہ پہنچا سکے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے۔ ایک اور روایت: لا تزال عصابة من امتی یقاتلون علی امر اللّٰہ قاهرین لعدوهم لا یضرهم من خالفهم حتی تأتیهم الساعة (صفحہ ۳۰۷)

اس روایت میں قتال سے مراد جنگ نہیں ہے، بلکہ غیر حربی کوشش ہے۔ (فتح الباری ۱۳/۳۰۶)

اس سے معلوم ہوا کہ بیت المقدس کے علاقہ میں ابدی طور پر مسلمانوں کا غلبہ مقدر کرایا گیا ہے۔ اس حدیث کے مطابق، حکومت اسرائیل کے قیام کے باوجود اس غلبہ کو قائم رہنا چاہیے۔

قرآن میں دو جگہ یہود کے ایک مخصوص گروہ (نہ کہ تمام یہودی نسل) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مسلسل سرکشی اور نافرمانی کی پاداش میں ان پر لعنت کی اور ان کو ذلیل وخوار بندر بنا دیا (سورۃ البقرۃ آیت ۶۵، سورۃ الاعراف آیت ۱۶۶) سورۃ المائدۃ کی آیت ۶۰ میں یہ اضافہ ہے کہ اس گروہ کو بیک وقت بندر اور خنزیر بنا دیا گیا۔ البتہ اس سلسلہ میں ابتدا سے مفسرین کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے کہ بندر اور خنزیر بنا دینے سے کیا مراد ہے۔ بعض اس کو حقیقی جسمانی تبدیلی (physical transformation) کے معنی میں لیتے ہیں اور بعض اس کو مجازی طور پر صرف فکری اور مزاجی تغیر (moral metamorphosis) قرار دیتے ہیں۔

مشہور تابعی مجاہد کا قول ہے کہ اصلاً ان کے دل مسخ کیے گئے نہ کہ خود ان کو (جسمانی اعتبار سے) بندر بنا دیا گیا۔ یہ عین اسی طرح کی ایک تمثیل ہے جیسی تمثیل یہود کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے (سورۃ الجمعہ ۵) میں بیان کی ہے کہ وہ "اس گدھے کی مانند ہیں جو اپنے اوپر کتابوں کا بوجھ لادے ہوئے ہو"۔ (مُسخت قلوبهم ولم یُمسخوا قردةً... وإنما هو مثل

ضربہ اللہُ "کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَاراً" تفسیر المنار ۱/۳۴۳)

جرمن نومسلم محمد اسد نے مجاہد کے اسی قول کو سامنے رکھتے ہوئے بقرۃ اور اعراف کی مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں کُوْنُوْا قِرَدَۃً خَاسِئِیْن کا ترجمہ (Be as apes despicable) کیاہے ۔یعنی ہو جاؤ بندروں کی مانند ذلیل وخوار ۔اس کے علاوہ حاشیہ میں مجاہد کے قول کو انگریزی میں اس طرح نقل کیا ہے :

'Only their hearts were transformed, that is, they were not really transformed into apes: this is but a metaphor (mathal) coined by God with regard to them, similar to the metaphor of "the ass carrying books." (*The Message of the Qur'an*, translated and Explained by Muhammad Asad, Dar al-Andalus, Gibralter, p. 228.)

تاہم اس لفظی بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر مسخ کو حقیقی جسمانی تبدیلی کے معنی میں لیا جائے تب بھی اس ضمن میں دو باتیں تمام مفسرین کے یہاں متفق علیہ ہیں ۔ایک یہ کہ صحیح حدیث کے مطابق نہ یہود بندر اور خنزیر کی نسل سے ہیں نہ یہ جانور یہود کی نسل سے ،بلکہ دونوں اللہ تعالیٰ کی مستقل مخلوق ہیں ۔

علامہ ابن کثیر نے ابو داؤد الطیالسی کے واسطہ سے عبد اللہ بن مسعود کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا بندر اور خنزیر مسخ شدہ یہود کی نسل ہیں ۔آپ نے فرمایا کہ نہیں ۔ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو لعنت زدہ ٹھہرا کر اسے مسخ کیا ہو اور پھر اس سے کوئی نسل چلی ہو ۔بلکہ یہ تو ایک مستقل مخلوق ہے جو واقعۂ مسخ کے پہلے سے موجود تھی ۔چنانچہ جب یہود پر خدا کا غضب نازل ہوا اور ان کو مسخ کر دیا تو ان کو انھیں کے جیسا بنا دیا (سألنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن القردہ والخنازیر أھی من نسل الیھود ؟ فقال : "لا ، ان اللہ لم یلعن قوماً قطّ فیمسخھم فکان لھم نسلٌ . ولکن ھذا خلقٌ کانَ ۔فلمّا غَضِبَ اللہُ علی الیھود فمسخھم جعلھم مثلھم") مختصر تفسیر ابن کثیر ۱/۵۳۱ ـ ۵۳۰

دوسرے یہ کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ وتابعین سے صراحۃً منقول ہے کہ کوئی مسخ شدہ قوم تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہی ،نہ اس نے کچھ کھایا ،نہ کچھ پیا ،اور نہ

اس سے توالد و تناسل کا کوئی سلسلہ جاری ہوا (لم يعش مسخ قط فوق ثلاثة ايام، ولم يأكل ولم يشرب ولم ينسل) مختصر تفسیر ابن کثیر ۱/۴،

مسجد اقصیٰ کے گرد و پیش میں جو آبادی ہے وہاں زبان کو مستثنیٰ کرکے بڑی حد تک پرانی دہلی کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ بھیڑ، گندگی، بدنظمی، شور و غل، بچوں کی اچھل کود، دیواروں پر حکومت کے خلاف احتجاجی نعرے وغیرہ —— آزادیٔ فلسطین کے لیے وہاں جو تنظیمیں زیادہ سرگرم ہیں ان میں ایک حركة المقاومة الاسلامية ہے جس کا مختصر نام (short form) حماس ہے۔ یہ ایک جذباتی اور انتہا پسند تنظیم ہے۔ اسی کے زیر قیادت، دسمبر ۱۹۸۷ کو ایک مخصوص حادثہ (المقطورة) کے بعد وہ پرشور تحریک وجود میں آئی جو اخبارات میں الانتفاضة کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے تحت فلسطینی لڑکوں اور نوجوانوں کو اکسایا گیا کہ وہ جہاں کہیں بھی کسی یہودی کو دیکھیں پتھر مار کر ان کا چہرہ زخمی کر دیں۔ جن لڑکوں نے اس تحریک میں حصہ لیا انھیں پُرفخر طور پر اولاد الحجارة کہا جاتا ہے۔

جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح ایک طاقت ور فوج کے مقابلہ میں "پتھر" اٹھانا بلاشبہ ایک مجنونانہ حرکت ہے۔ مگر اپنے اس طریقِ کار پر حماس کو اتنا یقین ہے کہ اس کے بقول عربوں کے تمام ٹینک اور میزائل بھی وہ کارنامہ انجام نہ دے سکے جو ان کے پتھر نے کر دکھایا، وہ پتھر جو "غاصب" کے چہرہ کو لہو لہان کر دیتا ہے (كل الدبابات وكل صواريخ العرب، ماساوت حجراً، حجراً يُرمي وجهَ المحتل)

اس علاقہ میں جس طرف سے بھی گزر ہوا اکثر دیواریں حماس کی طرف سے لکھے گئے جذباتی نعروں (شعارات) سے رنگین نظر آئیں۔ مثلاً: — نعم للحجر، لا للمؤتمر، پتھر کے لیے ہاں، کانفرنس کے لیے نہیں (یعنی ہمارا مسئلہ صرف پتھر کے ذریعہ لڑکر حل ہو سکتا ہے نہ کہ امن کانفرنسوں میں بات چیت کے ذریعہ)

— بالقوة وبالقوة فقط تحرر ارض فلسطين، طاقت اور صرف طاقت کے ذریعہ ہی سرزمین فلسطین کو آزاد کرایا جا سکتا ہے۔

— جند حماس للأقصى حراس، حماس کی فوج اقصیٰ کی محافظ۔

Through History

1967

Map showing the territories occupied by Israel during the war of 1967. The occupied territories of Sinai (Egypt) were evacuated in 1982.
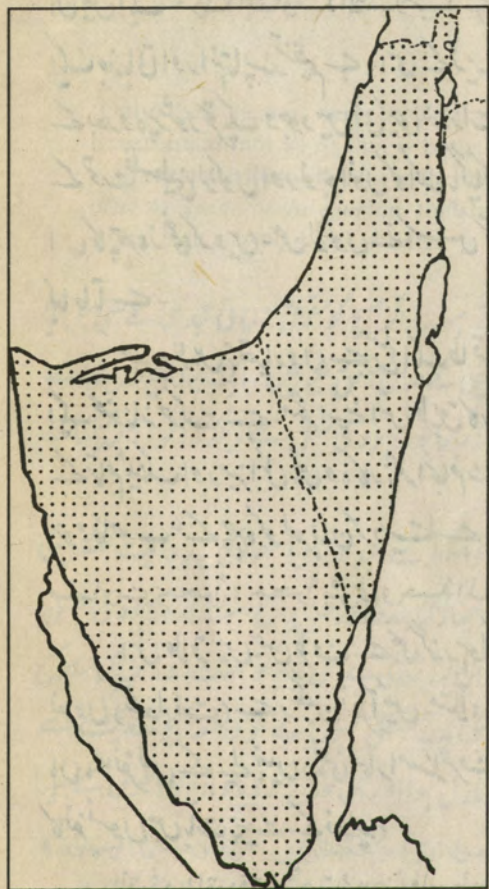
1994
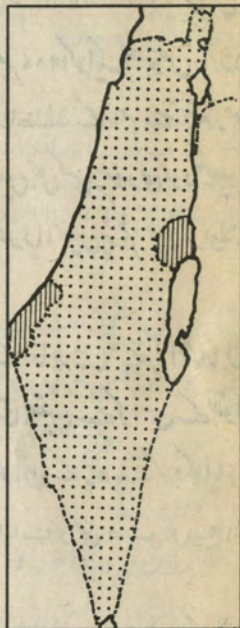
Map of Palestine after the Oslo Accord, showing the present Palestinian Authority

Palestine
Recent

1936
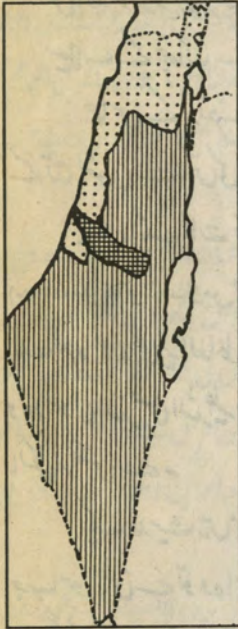
Map of Partition of Palestine recommended by the Royal (Peel) Commission

1947
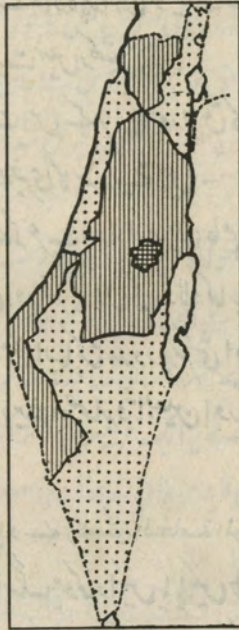
Map of Partition plan under United Nations Resolution 181 (11)

1949
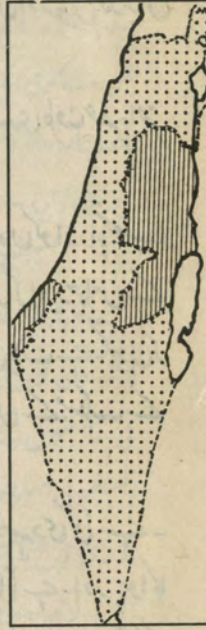
Map of Palestine af
1948 Arab-Israel W

 Arab State Jewish Territories Neutral Zone

--- صراعُنا مع اليهود صراعُ وجودٍ لا حدود، یہود کے ساتھ ہماری کش مکش ہمارے (قومی) وجود کی کش مکش ہے نہ کہ (جغرافیائی) حدود کی کش مکش۔

--- إن الجهاد فی سبیل الله ... هو الحل الراجح والأسلوب الفعال فی التفاهم مع أحفاد القِردة والخنازیر --- وما الحلول والمبادرات السلمیة الا غثاء کغثاء السَّیل، بندروں اور خنزیروں کی اولاد کے ساتھ معاملہ کرنے کے لیے جہاد فی سبیل اللہ ہی قابلِ ترجیح حل اور موثر ترین طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ پُرامن نوعیت کے سارے حل اور پیش قدمیاں سیلاب کے جھاگ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

حماس کے یہ نعرے ایک طرف اس کے مزاج اور طریقِ کار اور دوسری طرف عصرِ حاضر کے تقاضوں سے اس کی المناک بے خبری کا پتہ دیتے ہیں۔

یہاں ایک بات قابلِ غور ہے کہ عرب اخبارات میں عام طور پر یہودیوں کو ازراہِ تحقیر احفاد القردۃ والخنازیر یعنی بندروں اور خنزیروں کی اولاد کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر حماس کے ایک نعرہ میں بھی یہ الفاظ آئے ہیں۔ مگر ایسا کہنا حد درجہ سرکشی اور جہالت کی بات ہے۔ کیوں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث، صحابہ و تابعین اور تبعِ تابعین کے مسلک کے بالکل برعکس ہے۔

ایک حدیث میں مومن کو نرم پودے (کمثل الخامۃ الزرع) سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جب ہوا چلتی ہے تو وہ اس سے ہم آہنگ ہو کر دائیں یا بائیں طرف جھک جاتا ہے۔ اور ہوا کا زور گھٹنے کے بعد بدستور اپنی جگہ سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس منافق سخت تنے کی مانند ہوتا ہے جو ہوا کے ایک ہی جھٹکے میں اپنی جگہ سے اکھڑ کر گر جاتا ہے۔ دوسری طرف قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر تمہارے مخالفین صلح پر آمادہ ہوں تو تم بھی اللہ پر توکل کرتے ہوئے اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ۔ اگر مخالفین مصالحت کے بہانے تمہیں دھوکا دینے کا ارادہ رکھتے ہیں تب بھی اللہ تمہارے لیے کافی ہو جائے گا (الانفال ۶۲-۶۱)

مذکورہ حدیث اور آیت کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے قائدین نے، خصوصاً مسئلۂ فلسطین کے معاملہ میں، نہ تو حقیقی دانش مندی کا ثبوت دیا نہ حقیقی توکل کا۔ دانشمندی

کا تقاضا یہ تھا کہ جب ساری دنیا میں امن کا چرچا ہو رہا ہو اور قومی و بین اقوامی نزاعات کو پُرامن بات چیت کے ذریعہ حل کرنا تہذیب و شائستگی کا مسلّمہ معیار بن چکا ہو، تو وہ جنگ وقتال جیسی خلافِ زمانہ باتوں سے مکمل احتراز کرتے۔ وہ "معرکۂ حطین" کی تجدید کے بجائے "معاہدۂ حدیبیہ" کی تجدید کو اپنی پالیسی بناتے۔ دوسری طرف توکل علی اللہ کا تقاضا یہ تھا کہ عہد شکنی کے امکانی خطرہ کے باوجود "اغیار" کی طرف سے صلح کی ہر پیش کش کو فوراً قبول کر لیتے۔ مگر چونکہ بروقت ان دونوں میں سے کوئی ایک بات بھی متحقق نہ ہو سکی، اس لیے جان و مال کی بے پناہ قربانیوں کے علی الرغم آج تک ہمارے تمام مسائل، بشمول مسئلہ فلسطین، غیر حل شدہ پڑے ہوئے ہیں، بلکہ وہ مزید پے چیدہ ہو چکے ہیں۔

فلسطین کے ایک اخوانی نوجوان نے کہا کہ اسلام صرف عبادت نہیں ہے، وہ دین بھی ہے اور ریاست بھی۔ اس لیے اس الدین کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس حکومت ہو جو اسلامی قوانین کو نافذ کرے اور دشمنانِ خدا کے معاملہ میں مسلمانوں کی حمایت کرے اور دشمنوں کی سازشوں سے انھیں بچائے یہ ایک فریضہ ہے مگر اکثر مسلمان اس فرض سے غافل ہیں۔ الاخوان المسلمون مسلمانوں کو اسی کی طرف بلاتی ہے کہ وہ اس فریضہ کو ادا کریں اور اسلامی قوانین کو پوری طرح نافذ کریں:

الاسلام ليس عبادة فقط ولكنه دين ودولة - وهذا الدين لا بد له من دولة تطبق الاسلام وتحمي المسلمين من اعداء الله وترد كيد الاعداء عنهم - فهذا واجب لكن كثيرا من المسلمين غافلون عن هذا الواجب - والاخوان يدعونهم لتحقيق هذا الواجب والعمل على تطبيق الشريعة والحكم بالاسلام -

میں نے کہا کہ یہ پورا نظریہ ایک غلط تفسیرِ دین پر قائم ہے۔ الاسلام دین ودولة اسلام کی ایک مبتدعانہ تفسیر ہے۔ زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ الاسلام دین ودعوة۔ یعنی ذاتی زندگی میں دین دار بننے کے بعد مسلمان پر جو دوسری ذمہ داری ہے وہ دعوت ہے نہ کہ حکومت۔ عبادت اور دعوت ذمہ داری ہے، اور حکومت اللہ تعالیٰ کا ایک عطیہ۔ حکومت واقتدار اسلامی عمل کا ھدف نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی حاصل ہوتا ہے اور کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ

اس معاملہ کی پوری تفصیل میں نے اپنی کتاب دین کامل میں کی ہے۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ الدین الکامل کے نام سے قاہرہ سے چھپ چکا ہے۔

ایک فلسطینی نوجوان نے کویت کی دستوری تحریک کا حوالہ دیا کہ اس نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ ٹررزم میں اور قبضہ کے خلاف مقاومت میں فرق کیا جائے جو کہ قوموں کا جائز حق ہے (الحرکۃ الدستوریۃ الاسلامیۃ فی الکویت طالبت بالتفریق بین الارھاب و حق الشعوب فی مقاومۃ الاحتلال)

میں نے کہا کہ اس قسم کے فرق دماغوں میں ہوتے ہیں وہ عملی زندگی میں نہیں ہوتے اور جب دو فریق کے درمیان نزاع کی صورت پیدا ہو جائے تو اسلام اور عقل دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس وقت ذہنی معیار کو پس پشت ڈال کر یہ دیکھا جائے کہ عملی صورت حال کے مطابق کیا ممکن ہے اور کیا ممکن نہیں۔

میں نے کہا کہ عملی بنیاد پر مذکورہ فیصلہ کو میں درست سمجھتا ہوں، آپ اگر ذہنی معیار پر اصرار کریں گے تو آپ وہ تو نہیں پائیں گے جو آپ پانا چاہتے ہیں۔ البتہ جو کچھ آپ کو ملا ہوا ہے اس کو بھی آپ کھو دیں گے۔

عرب اخبارات و رسائل اس قسم کے عنوانات سے بھرے رہتے ہیں:

بقاء القدس فی ید اسرائیل یعنی ان الاستعمار الصھیونی قائم

(قدس کا اسرائیل کے ہاتھ میں باقی رہنا یہ معنی رکھتا ہے کہ صہیونی استعمار قائم ہے)

مدینۃ القدس الشریف تنادیکم (قدس آپ کو پکار رہا ہے)

ان العرب سیرمون اسرائیل فی البحر (عرب اسرائیل کو سمندر میں پھینک دیں گے)

القدس الشریف: بین مؤامرۃ التھوید وطمس ھویتھا الاسلامیۃ

(قدس یہودی سازش اور اس کے اسلامی تشخص کو مٹانے کی کوشش کے درمیان)

یروشلم میں مسجد اقصیٰ کے قریب ڈیڑھ ایکڑ کے رقبہ میں ایک مسجد اور مرکز ہے۔ اس کا نام زاویۃ الفریدیہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غیر منقسم ہندستان کے ایک صوفی بابا فرید گنج شکر چار سو سال پہلے یہاں زیارت کے لئے آئے تھے۔ اس وقت فلسطین میں عثمانی ترکوں کی حکومت

تھی۔ ترک گورنر نے بابا فرید کو مسجد کے دو کمرے دے دیے۔ بعد کو ہندستانی نوابوں کے تعاون سے کچھ اور عمارتیں یہاں بنائی گئیں۔

سہارن پور کے خواجہ نذیر حسن انصاری کو اس وقت کی ہندستانی حکومت نے ۱۹۲۲ میں یہاں سے ایڈمنسٹریٹر کے طور پر بھیجا تھا۔ ۱۹۵۳ میں ان کی وفات ہوگئی۔ اب ان کے پوتے نذر حسن انجینیر اس وقف کے ٹرسٹی ہیں۔ انڈیا سے اس ٹرسٹ کو چھ ہزار روپے سالانہ کی امداد دی جاتی ہے۔

یروشلم کی موتمر کا دعوت نامہ مجھے مل چکا تھا کہ اس کے بعد فروری ۱۹۹۴ میں میرا ایک سفر رباط (المغرب) کے لیے ہوا۔ وہاں الجزائر کے ڈاکٹر محمد السلیمانی سے ملاقات ہوئی۔ ان سے ذکر ہوا تو انھوں نے کہا کہ آپ کو یروشلم کی موتمر کا دعوت نامہ ہرگز قبول نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے پوچھا کیوں۔ انھوں نے کہا کہ آپ کا وہاں جانا اسرائیل کی تصدیق کے ہم معنی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ میری تمنا تھی کہ میں قدس میں داخل ہو کر اللہ کے لیے سجدہ کروں جہاں پیغمبروں نے سجدہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی نیت کچھ بھی ہو مگر عملاً تو وہ اسرائیل کی تصدیق بن جائے گا۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا یہ طرز فکر سراسر ایک غیر مسنون طرزِ فکر ہے۔ قدیم مکہ میں تقریباً وہی صورت پیش آئی جو موجو[illegible]ما میں فلسطین میں پیش آئی ہے۔ قریش نے رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ پر سخت [illegible]لم کیے، یہاں تک کہ ان کو ان کے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا، اور پھر مکہ کے اوپر اپنا محر[illegible] قتدار قائم کر لیا۔ اس کے بعد یہ واقعہ ہوا کہ مکہ میں دشمنانِ اسلام کا اقتدار [illegible] رہتے ہوئے رسولؐ اور اصحاب رسولؐ نے عمرہ کے لیے مکہ کا سفر کیا۔ پہلی بار اہل مکہ نے [illegible]احل نہیں ہونے دیا تو اگلے سال دوبارہ سفر کیا اور مکہ میں داخل ہو کر کعبہ کا طواف کیا جس میں اب ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے اور پھر کسی احتجاج یا ٹکراؤ کے بغیر مدینہ واپس گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوچ وہ ہوتی جو آپ حضرات کی سوچ ہے، یعنی مکہ میں داخلہ کو آپ دشمن کے اعتراف کے ہم معنی سمجھتے تو آپ کبھی بھی مکہ میں داخل نہ ہوتے۔

اس واقعہ سے رسول اللہؐ کی ایک خاص سنت اخذ ہوتی ہے۔ اور وہ ہے دو چیزوں کو ایک دوسرے میں نہ ملانا۔ پس یہ بھی رسول اللہؐ کی ایک سنت ہے کہ دو مختلف چیزوں کو ایک

دوسرے سے مختلط نہ کیا جائے (عدم الخلط بین الشیئین ھو سنۃ من سنن الرسول)
میں نے کہا کہ آپ جیسے لوگوں کی سوچ منفی سوچ ہے۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پورے معنوں میں مثبت انداز میں سوچتے تھے (طریقتکم فی التفکیر سلبیۃ والرسول کان یفکّر بطریقۃ ایجابیۃ بکل معنی الکلمۃ)

ایک زمانہ تھا کہ عرب دنیا میں الاخوان المسلمون کے سیاسی فکر کی دھوم تھی مگر اب اس فکر کی سطحیت لوگوں پر واضح ہونے لگی ہے۔ چنانچہ اہل علم میں اس کے ناقدین پیدا ہو رہے ہیں۔ ایک صاحب نے مصر کے دکتور عبد الصبور مرزوق (پیدائش ۱۹۲۵) کا قول سنایا کہ کیا یہ بے معنی نہیں ہے کہ ہم اسلامی حکومت کا مطالبہ کریں اور حال یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہاتھ نیچے کا ہاتھ بنا ہوا ہے۔ وہ خوراک اور ہتھیار اور کپڑے اغیار سے مانگتا ہے۔ ہم ہر معاملہ میں دوسروں کے محتاج ہیں۔ اور اگر وہ چاہیں تو اپنی گاڑیاں ہمیں نہ دیں اور ہم دوبارہ گدھے اور خچر کی سواری کی طرف لوٹ جائیں:

الیس من العبث ان نطالب بدولۃ اسلامیۃ و ید المسلمین السفلیٰ تطلب من غیرھا الطعام والسلاح و الملابس ونظل عالۃ علی غیرنا ولو شاؤا حبسوا عنا السیارات مثلا ورجعنا للبغال والحمیر۔

میں نے کہا کہ یہ درست ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان علم سے لے کر کردار تک ایک پچھڑی ہوئی قوم بن چکے ہیں۔ مفت کے پٹرو ڈالر سے حاصل کی ہوئی ظاہری چمک دمک کو ہٹا دیجئے تو اندر سے وہ ہر اعتبار سے کھوکھلے نظر آئیں گے۔ ایسی حالت میں حکومت اور خلافت کی باتیں کرنا وقت کا ضیاع ہے نہ کہ کوئی حقیقی کام۔

ایک سنجیدہ قسم کے عرب عالم سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں پر تنقید کرتے ہوئے کہا: ھم یَحُلّون العقدۃ بطریقۃٍ تجعل العقدۃ الواحدۃ عُقدتَین (وہ گرہ کو اس طرح کھولنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ایک گرہ کو دو گرہ بنا دیتی ہے)

میں نے کہا کہ یہی بات برصغیر ہند کے تمام مسلم رہنماؤں پر صادق آتی ہے۔ ہر ملی گرہ جس

کو کھولنے کے نام پر وہ اٹھے اس نے ایک گرہ کو کئی گرہ بنا دیا۔ تقسیم کی تحریک، شاہ بانو تحریک، بابری مسجد تحریک، اس کی قریبی مثالیں ہیں۔

یروشلم کی کانفرنس میں شرکت کے لیے روم سے بار بار ٹیلی فون آئے۔ میں وہاں جانے کے لیے صرف اس لیے تیار ہوا تھا کہ اس طرح مجھ کو مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کا موقع ملے گا۔ تاہم ایک خدشہ بھی لگا ہوا تھا۔ عرب اخبارات مسلسل اس کی جو تصویر پیش کر رہے تھے، اس سے میں نے سمجھا تھا کہ مسجد اقصیٰ کے چاروں طرف اسرائیل کی بہت بڑی فوج کھڑی ہوئی ہوگی۔ اور عین ممکن ہے کہ وہ مجھے اندر داخل ہونے کی اجازت ہی نہ دیں اور میں نامراد ہو کر وہاں سے لوٹ آؤں۔

عرب اخبارات نے اس معاملہ میں اتنا غلو کیا ہے کہ انھوں نے فرضی تصویریں چھاپ کر پورے معاملہ کو غلط رنگ میں پیش کیا (اس کی کچھ تفصیل اِس سفرنامہ میں موجود ہے)

جہاں تک میں نے سمجھا ہے فلسطینیوں کے ساتھ اسرائیل کی دشمنی اصلاً سیاسی دشمنی ہے نہ کہ دینی دشمنی۔ مگر فلسطینیوں نے اور عربوں نے انتقامی جذبہ کے تحت دونوں میں فرق نہیں کیا۔ انھوں نے اسرائیل کو اپنا سیاسی دشمن بتانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا شروع کیا کہ وہ مذہبی اعتبار سے خود اسلام کا دشمن ہے۔ ان حضرات کے یہ بیانات قرآن کے اس حکم کے خلاف ہیں کہ دشمنی کے وقت بھی انصاف کی روش پر قائم رہو (المائدہ ۸)

یروشلم کی کانفرنس میں شرکت پر مجھ کو کئی سخت تبصرے سننے پڑے۔ ایک صاحب نے کہا ــــ آپ بھی آخر کار یہودی سازش کا شکار ہو گئے:

You too at last fell victim to Zionist Conspiracy.

میں نے کہا کہ آپ لوگ کتنی آسانی سے اس طرح کے جملے کسی کے بارہ میں بول دیتے ہیں۔ حالاں کہ وہ اسلام میں جائز ہی نہیں۔ اس طرح کے تبصرے محض ظن و قیاس ہیں نہ کہ دلیل۔ ظن کی بنیاد پر آپ کسی کے بارہ میں اچھی رائے تو ظاہر کر سکتے ہیں، مگر ظن کی بنیاد پر بری رائے ظاہر کرنا یقینی طور پر حرام ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی کے بارے میں اس طرح کا جملہ نہیں کہا۔

عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم دانشوروں پر یہودی سازش کا تصور اس طرح غالب ہے کہ وہ ہر واقعہ میں یہودی سازش کو کام کرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ موجودہ صدی کے آغاز میں ترکی کی عثمانی خلافت یہودیوں کی سازش سے ختم ہوئی۔ اقبال کا شعر ہے :

چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا   سادگی اپنوں کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

حیرت ہے کہ یہ بات وہ لوگ بھی کہتے ہیں جو حکمتِ قرآن (Quranic Wisdom) کے علم بردار ہیں۔ حالاں کہ یہ بات قرآن کی تردید کے ہم معنی ہے۔ قرآن میں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ اگر تم تقویٰ اور صبر کرو تو دشمنوں کی سازش تمہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچائے گی (آل عمران ۱۲۰) اس قرآنی ارشاد کی روشنی میں ہمیں ملی مصائب کے بارہ میں کہنا چاہیے کہ وہ ہمارے اندر تقویٰ اور صبر کے فقدان کا نتیجہ تھا نہ کہ حقیقتہً کسی کے سازشی منصوبہ کا نتیجہ۔

ایک عرب عالم سے گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ مسلمان کیوں ایسا کر رہے ہیں کہ ہر جگہ حکومتوں سے متشددانہ ٹکراؤ کر کے اپنے آپ کو مروا رہے ہیں۔ اس قسم کی ہلاکت خیز پالیسی تو نہ عقل کے مطابق ہے اور نہ اسلام کے مطابق۔

انھوں نے کہا کہ جب اہل حق سے ان کا حق چھینا جائے گا تو لازم ہے کہ وہ اس کو واپس حاصل کریں۔ آپ جانتے ہیں کہ لوگ جب ہر قسم کا علاج کر چکے ہوتے ہیں تو آخر میں وہ داغنے والے طریقِ علاج کو استعمال کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ ایک غیر پسندیدہ علاج ہے۔ ہم نے موجودہ طریقہ کو اسی وقت اختیار کیا جب کہ ہم مجبور ہو گئے۔ مشکل کو وہی اختیار کرتا ہے جو مضطر ہو :

اذا سُلبَ اهل الحق حقهم فلابد ان يستعيدوه ۔ واذا اضطر الناس الى استنفاد كل وسائل العلاج فإن آخر العلاج الكى ، ولو انه علاج غير مستحب ۔ ولن نلجأُ اليه الا إذا اضطررنا ، فلا يركب الصعب الا المضطر ۔

میں نے کہا کہ موجودہ حالت میں تشدد کا طریقہ علاج نہیں ہے بلکہ وہ خودکشی ہے۔ اور عملاً آج یہی ہو رہا ہے۔ انھوں نے دوبارہ سوال کیا کہ پھر یہ مسلمان کیا کریں۔ میں نے کہا کہ انھیں دو میں سے ایک کام کرنا چاہیے۔ یا تو وہ سیاسی اقتدار کے مسئلہ کو علیٰ حالہ چھوڑ کر دوسرے

غیر سیاسی میدانوں میں تعمیر و ترقی کی جدوجہد کریں جس کا میدان ہر ملک میں پوری طرح موجود ہے۔
اور اگر بالفرض وہ سیاسی جدوجہد ہی کو ضروری سمجھتے ہیں تو ہم اور گن سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے خالص پُرامن انداز میں اپنی تحریک چلائیں۔ جیسے انڈیا میں مہاتما گاندھی نے اور ساؤتھ افریقہ میں نیلسن منڈیلا نے کیا۔ مسلمان پر تشدد جدوجہد کا طریقہ چھوڑ کر پُرامن جدوجہد کا طریقہ اختیار کرلیں۔ میں نے کہا کہ موجودہ مسلمانوں کا کیس اضطرار کا کیس نہیں ہے، وہ غلط چوائس لینے کا کیس ہے۔ ان کے لیے الیسر کو اختیار کرنے کا موقع پوری طرح موجود تھا۔ مگر انھوں نے ناقابل فہم نادانی کے تحت اعسر کو اپنے لیے اختیار کرلیا۔ حالانکہ وہ واضح طور پر سنّتِ رسولؐ کے خلاف ہے۔
اورنگ زیب نے اپنے باپ شاہ جہاں کو ۱۶۵۸ء میں گرفتار کرلیا، اور آگرہ کے قلعہ میں اس کو قید کردیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار شاہ جہاں نے پریشانی کا خط لکھ کر اورنگ زیب کے پاس بھجوایا۔ اورنگ زیب نے اس کے جواب میں فارسی کا ایک مصرعہ لکھ کر بھیج دیا —— زخمی چڑیا جب جال میں پھنس جائے تو اس کو برداشت سے کام لینا چاہیے :

مرغ بسمل چوں بہ دام افتد تحمل بایدش

اس کا مطلب، دوسرے لفظوں میں یہ تھا کہ حقیقت پسندی سے کام لیجئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فلسطین کا معاملہ جو اتنا زیادہ بگڑ گیا اس کا سبب یہی تھا کہ اس معاملہ میں مسلم رہنماؤں نے حقیقت پسندی سے کام نہیں لیا۔ حسن البنا سے لے کر یاسر عرفات تک بلا استثناء ہر عالم اور ہر قائد اس معاملہ میں غیر حقیقت پسندانہ رہنمائی دیتا رہا۔ یہاں تک کہ مسلمان ذلت اور تباہی کی آخری حد پر پہنچ گئے۔
۱۹۴۸ میں اقوام متحدہ نے جو تقسیم کی تھی اس میں فلسطین کا نصف سے زیادہ حصہ عربوں کے پاس تھا۔ اسی کے ساتھ پورا یروشلم بھی انھیں حاصل تھا۔ مگر مسلم قیادت نے پرجوش طور پر اس تقسیم کو نامنظور کردیا۔ اس کے بعد دونوں فریقوں کے درمیان لامتناہی جنگ چھڑ گئی جس کا سارا فائدہ یہودیوں کو ملا اور سارا نقصان مسلمانوں کے حصہ میں آیا۔
اگر حقیقت پسندی سے کام لیا جاتا تو کرنے کا کام یہ تھا کہ فلسطین کے ملے ہوئے حصہ میں

عربوں کی حکومت قائم کی جائے۔ اور اس کے یہودی حصہ میں مسلمان سیکولر شہری بن کر اسی طرح تعمیر و ترقی کے کام میں سرگرم ہو جائیں جس طرح لاکھوں عرب آج بھی غیر مسلم ملکوں میں تعمیر و ترقی کے عمل میں مصروف ہیں۔

ایک وقت تھا کہ مصر کے فوجی صدر جمال عبد الناصر اور دوسرے لوگ یہ کہتے تھے کہ عرب اسرائیل کو سمندر میں پھینک دیں گے (ان العرب سیرمون اسرائیل فی البحر) لیبیا کے کرنل معمر القذافی اتنے جوش میں تھے کہ انھوں نے اپنے ساتھی مسٹر جلود کو یہ کہہ کر اسپیشل جہاز سے چین بھیج دیا کہ وہاں سے ایٹم بم خرید کر لاؤ تاکہ اس کو اسرائیل کے اوپر گرا کر ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔ یاسر عرفات اور دوسرے تمام لیڈر اسی قسم کی پر جوش بولی بول رہے تھے۔

مگر آج صورت حال بدل چکی ہے۔ یاسر عرفات پچھلی سیٹ پر چلے گئے۔ یہاں لیبیا سے قریبی واقفیت رکھنے والے ایک صاحب نے کہا کہ کل کے معمر قذافی کے مقابلہ میں آج کے قذافی مکمل طور پر بدل چکے ہیں (القذافی الیوم یختلف تماما عن قذافی الامس)

یہ بات خود قذافی کی طرف سے پریس میں آچکی ہے۔ المجلہ کے نمائندے، عبد الرحمٰن الراشد اور عبد اللطیف المناوی نے لیبیا جا کر معمر قذافی کا ایک انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں قذافی نے کہا کہ پہلے ہم آزادیٔ فلسطین کے بارہ میں جنگ کی باتیں کیا کرتے تھے۔ لیکن انقلابات کی صورت حال نے ثابت کیا ہے کہ یہ ضروری نہیں۔ جس چیز کو بدلنا ہے وہ خود ہمارا طریق کار ہے۔ (یعنی بات چیت کا طریقہ) جہاں تک جنگِ فلسطین کا معاملہ ہے تو اس سلسلہ میں جنوبی افریقہ کو دیکھئے۔ جہاں جنگ کے بغیر اسی نوعیت کا مسئلہ حل کر لیا گیا۔ آزادیٔ فلسطین کے لیے بھی ضروری نہیں کہ ہم جنگ چھیڑیں، اگر فلسطینی لوگ اپنی سرزمین میں واپس آجائیں اور ان کی ۵ یا ۶ ملین تعداد یہودیوں کے ساتھ ایک جمہوری نظام حکومت میں شرکت پر راضی ہو جائے تو آخر کار ان کا مسئلہ مکمل طور پر حل ہو جائے گا (الرسالہ مئی ۱۹۹۵)

اس سے پہلے قذافی مسلح جدوجہد کے زبردست حامی تھے۔ حتی کہ انھوں نے اپنی قوم کو یہ گانا سکھایا کہ اِحناشرّابون دم۔ مگر ہلاکت خیز تجربے کے بعد اب نہ صرف قذافی بلکہ فلسطین کے یاسر عرفات سے لے کر فلپائن کے نور مسواری تک ہر ایک مسلح جدوجہد کی بولی چھوڑ کر پر امن جدوجہد کی بولی بول رہا ہے۔

زیادہ اہم مسئلہ

ریحاوم زیوی (Rehavam Zeevi) اسرائیل کی فوج میں ایک آرمی جنرل تھے۔ان کی عمر اب ۶۴ سال ہے۔فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ پالی ٹکس میں شامل ہو گئے ہیں۔اس وقت وہ اسرائیل کی پارلی منٹ (Knesset) کے ممبر ہیں۔وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو اسرائیل میں پرو ٹرانسفر (protransfer) کہا جاتا ہے۔یعنی اس نظریہ کے حامی کہ عربوں کو فلسطین سے نکال کر انھیں دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے۔

امریکی میگزین نیوز ویک (*Newsweek*) کے نمائندہ اسٹینگر (Theodor Stanger) نے ان سے اسرائیلی پارلی منٹ کے دفتر میں ملاقات کرکے ان کا انٹرویو لیا۔ایک سوال وجواب یہ تھا: (نیوز ویک ۱۲ نومبر ۱۹۹۰ صفحہ ۵۶)

س: کیا آپ فلسطینیوں کے ساتھ امن چاہتے ہیں؟

ج: فلسطینی لوگوں کے لیے واحد حل یہودیوں سے علٰیحدگی ہے۔ہر قوم اپنے باپ دادا کی زمین کی طرف لوٹنے کا حق رکھتی ہے۔ہم یہودی اپنے باپ دادا کی زمین کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ فلسطینیوں کے باپ دادا یہاں سعودی عرب، سوڈان اور لیبیا سے آئے تھے (اس لیے وہ دوبارہ وہاں لوٹ جائیں)

س: کیا آپ دس لاکھ سے اوپر ان فلسطینیوں کو زبردستی بسوں اور ٹرکوں میں بھریں گے اور انھیں لے جاکر باہر ڈال دیں گے؟

ج: مسٹر زیوی نے جواب دیا کہ نہیں۔ہم چاہتے ہیں کہ عرب ممالک انھیں اپنے یہاں بلالیں یا فلسطینی خود ایسا کریں کہ وہ ڈیڑھ لاکھ، دو لاکھ سالانہ کی تعداد میں یہاں سے جانا شروع کریں۔چند سال کے بعد یہاں کوئی مسئلہ نہ ہوگا:

In a few years, there would be no problem. (p. 56)

یہ ایک انتہا پسند یہودی کی بات ہے۔اس طرح کے انتہا پسند افراد ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ نہ صرف دوسری قوموں میں بلکہ خود مسلمانوں میں بھی ایسے انتہا پسند افراد مل سکتے ہیں مگر ایسے انتہا پسند افراد کبھی کسی قوم میں قبولِ عام حاصل نہیں کرتے۔ان کے لیے صرف یہ انجام مقدر ہے کہ

وہ چند سال تک اس قسم کے سخت الفاظ بولیں اور اس کے بعد مر کر تاریخ کے قبرستان میں دفن ہو جائیں۔

کتے بھونکتے رہتے ہیں اور ہاتھی چلتا رہتا ہے ——— یہ مثل ایسے ہی مسائل کے لیے بنائی گئی ہے، اور بلاشبہہ ایسے مسائل کا اس سے بہتر کوئی حل نہیں۔

۱۹۷۸ کے اواخر میں مصر کے مقتول صدر انور سادات نے اسرائیل کے ساتھ امن مذاکرات کے لیے پیش قدمی کی۔ جس کے نتیجہ میں بالآخر فریقین نے اس معاہدہ پر دستخط کیے جو کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس سلسلہ میں مصر اور اسرائیل کے درمیان جو بات چیت ہوئی اس کی سرپرستی سابق امریکی صدر جمی کارٹر (Jimmy Carter) نے کی تھی۔ نیز انھیں کے حسب منشا، معاہدہ کا آخری مسودہ تیار کیا گیا، جس کا پورا نام یہ تھا:

A Framework for Peace in the Middle East Agreed at Camp David

اس معاہدہ کی دفعہ نمبر ۲ کی شق (C) مغربی کنارہ اور غازہ پٹی میں فلسطینیوں کی حکومتِ خود اختیاری (Self-governing authority) کے بارہ میں تھی۔ مگر اس کی عبارت نہایت مبہم اور بالواسطہ انداز میں (باسلوبِ غامضٍ وغیر مباشرٍ) لکھی گئی تھی۔ اس وقت محمد ابراہیم کامل مصر کے وزیر خارجہ تھے۔ اسی کے ساتھ امن مذاکرات کے دوران وہ سادات کے خصوصی ایڈوائزر بھی تھے۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے اس پہلو پر توجہ دلاتے ہوئے سادات سے کہا کہ معاہدہ میں یہ بات بالکل واضح اور براہِ راست الفاظ میں درج ہونی چاہیے کہ فلسطینی مقررہ حدود کے اندر اپنی آزاد اور خود مختار حکومت کی تشکیل کا حق رکھتے ہیں۔ اس کے جواب میں سادات نے کہا کہ خود مجھے اس کا احساس ہے اور اس معاملہ کی مزید وضاحت کے لیے میں نے جمی کارٹر سے بات چیت بھی کی تھی۔ لیکن انھوں نے کہا کہ اسے یوں ہی رہنے دیا جائے۔ کیونکہ اس کو بدلنے کی صورت میں مجھے اس کی قیمت اپنی کرسئ صدارت سے ادا کرنی پڑے گی:

'It would cost me my chair.'

(السلام الضائع فی اتفاقیات کامب دیفید، مطبوعات ادارۃ الشرق الاوسط، صفحہ ۶۰۳)

آج انسان کھلے طور پر ایک حق کا اعتراف اس لیے نہیں کرتا کہ اس کے نتیجہ میں وہ دنیا کے وقتی اور محدود اقتدار کی کرسی سے محروم ہو جائے گا۔ حالاں کہ مرنے کے بعد جب انسان یہ دیکھے گا کہ مقتدرِ اعلیٰ کے دربار میں سچائی کی کرسی (مقعد صدقٍ) پر صرف وہی لوگ بٹھائے گئے ہیں، جنھوں نے دنیا میں اعلانِ حق کی خاطر اپنی "کرسی" کھودی تھی۔ تو وہاں وہ اپنی کرسی اور اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جائے گا۔ مگر اس وقت اس کے حصہ میں حسرت وافسوس کے سوا کچھ نہیں آئے گا کیوں کہ آخرت کی کامیابی کے لیے وہی قربانی مطلوب ہے جو دنیا میں پیش کی گئی ہو۔ آخرت کے لیے آخرت میں قربانی کی پیش کش خود اپنے خلاف حجت قائم کرنا ہے۔ یہ انسان کو عذاب کا مستحق بناتا ہے نہ کہ انعام واکرام کا۔

ایک عرب اسکالر نے گفتگو کے دوران بتایا کہ مختلف ملکوں کے بارہ میں عالمی سطح پر جو تازہ اعداد وشمار سامنے آئے ہیں، ان میں تمام عرب ممالک کو بلا استثناء علمی اعتبار سے فاقہ زدہ (الدُّوَل الجائعۃ عُلمیاً) قرار دیا گیا ہے جب کہ ان کے مقابلہ میں اسرائیل کو جدید ٹکنالوجی کا حریص ملک (دولۃ نھمۃ تکنولوجیاً) بتایا گیا ہے۔ یہی فرق ایک لفظ میں عربوں کی ہر محاذ پر مسلسل شکست کا واحد سبب ہے۔ قدیم زمانے میں کہا جاتا تھا —— جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ آج "لاٹھی" کی جگہ سائنس اور ٹکنالوجی نے لے لی ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں "بھینس" پر براہِ راست یا بالواسطہ قبضہ اسی کا ہوتا ہے جس کے پاس سائنس اور ٹکنالوجی کی طاقت ہے۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ میں سائنس کو طاقت کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ ایسی حالت میں سائنس میں پس ماندہ قوم کا برتر قوم سے جنگ کرنا صرف خودکشی ہے نہ کہ جہاد فی سبیل اللہ۔

ایک یہودی سے گفتگو ہوئی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور عربی زبان اچھی جانتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کہا جاتا ہے کہ آپ لوگ پورے علاقہ پر اسرائیلی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں مدینہ اور خیبر بھی شامل ہے۔ اس نے کہا کہ یہ اسرائیل کی کوئی قومی پالیسی نہیں۔ کچھ یہودی انفرادی طور پر اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔

پھر اس نے کہا کہ بالفرض یہودیوں کا ایسا ہی خیال ہو تب بھی آپ لوگ اس کو اتنا

زیادہ اہمیت کیوں دیتے ہیں۔ ہم کو دیکھئے۔ ہم جانتے ہیں کہ الاخوان المسلمون کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا نشانہ ساری دنیا میں اسلامی حکومت قائم کرنا ہے (هدف الاخوان هو اقامة دولة الاسلام العالمية) اس کے مطابق، نہ صرف اسرائیل کو اسلامی حکومت کا جزیہ گزار بننا ہے بلکہ ہم دنیا کے جس حصہ میں بھی ہوں ہر جگہ ہمیں اسلامی حکومت کا ماتحت بننا پڑے گا۔ مگر ہمیں اس قسم کی باتوں پر کوئی پریشانی نہیں۔

میں نے پوچھا کہ آپ کے پریشان نہ ہونے کی وجہ کیا ہے۔ اس نے کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ الاخوان المسلمون مصر میں ۱۹۲۸ میں قائم ہوئی۔ اس طرح اس کے قیام کو تقریباً ستر سال ہو رہے ہیں۔ ستر سال کے عرصہ میں وہ خود اپنے ملک مصر میں بھی اپنے تصور کی اسلامی حکومت قائم نہ کر سکی۔ پھر اس رفتار سے پوری دنیا کو اسلام کا سیاسی ماتحت بنانے کے لیے تو سات ہزار سال بھی ناکافی ہیں۔ ایسی حالت میں ہم ابھی سے اس کے لیے کیوں پریشان ہوں۔

قرآن میں واقعہ اسراء کے ذکر کے تحت ارشاد ہوا ہے: سبحان الذی اسری بعبده لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی الذی بارکنا حوله لنریه من آیاتنا (بنی اسرائیل ۱) اس آیت میں ایک سوال یہ ہے کہ لنریه من آیاتنا (تاکہ رسول کو ہم اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں) سے کیا مراد ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کو بارکنا سے جوڑا ہے۔ یعنی قدس کے آس پاس کی برکتیں دکھائیں۔ لیکن زیادہ صحیح رائے ان لوگوں کی ہے جنھوں نے اس کو اَسریٰ سے جوڑا ہے اور کہا ہے کہ اس سے مراد آپؐ کو ایک رات میں مکہ سے مسجد اقصیٰ لے جانا ہے جو ایک مہینہ کی مسافت پر واقع ہے (إسراؤه من مكة الى المسجد الاقصى فى ليلة وهو مسيرة شهر) القرطبی ۲۱۲/۱۰

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اِس آیت میں ایک اہم سبق تھا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم دانش وروں نے اور مسلم علماء نے نہ اس کو سمجھا اور نہ وہ اس کو استعمال کر سکے۔

یہ اسراء در اصل فطرت کے اس عظیم امکان کو دکھانا تھا جس کو ہم تیز رفتار کمیونی کیشن کہتے ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس نئے دور کے سرے پر پیدا کیے گئے۔ اس لیے آپ کو مخصوص اہتمام کے تحت اس فطری طاقت کو پیشگی طور پر دکھا دیا گیا۔ تاکہ آپ کی امت اس

سے آشنا ہو جائے اور جب یہ امکان اپنی پوری شکل میں ظاہر ہو تو اس کو دین کی خدمت میں استعمال کر سکے۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں اور مسلم دانش وروں نے قدس کے سیاسی پہلو کو دیکھا، مگر اس سے وابستہ وسیع تر اور عظیم تر پہلو (جدید کمیونی کیشن) کی حقیقت کو وہ سمجھ نہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست کی چٹان سے تو وہ نصف صدی سے ٹکرا رہے ہیں مگر کمیونی کیشن کی جدید طاقت کو دینِ حق کے لیے استعمال کرنا ان کے لیے ممکن نہ ہو سکا۔

پاکستان کے لوگ پاکستان کو ملک خداداد کہتے ہیں۔ مثلاً لاہور کے ایک اسلامی ماہنامہ (اپریل ۱۹۹٦) میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کا قیام اللہ کی ایک آیت اور معجزہ ہے۔ اس کی پشت پر اکابرینِ ملت کی چار سو برس کی کوششیں ہیں۔ پاکستان خدائی تدبیر کے تحت وجود میں آیا۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی درج ہے کہ پاکستان جو اسلام کے لیے بنا تھا وہ اسلام کو چھوڑ کر سیکولرزم کی طرف بگٹٹ رواں دواں ہے۔ اسی رسالہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پاکستان مکمل طور پر یہودی نرغہ میں ہے۔ یہودی سازشوں نے اس کا رخ اسلام کے بجائے سیکولرزم کی طرف کر دیا ہے۔ حالاں کہ اس کے بعد پاکستان کے علاحدہ ملکی وجود کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہتا۔

یہ رسالہ قرآنک وزڈم کا علم بردار ہے۔ مگر مذکورہ بات کا قرآنک وزڈم سے کوئی تعلق نہیں۔ کیوں کہ قرآن میں تو یہ تصور دیا گیا ہے کہ خدائی تدبیر ہر مخالف تدبیر پر بالاثابت ہوتی ہے، وان کان مکرھم لتزول منہ الجبال۔ مگر پاکستان کے قرآنی دانشور یہ خبر دے رہے ہیں کہ پاکستان میں نعوذ باللہ خدائی تدبیر پر یہودی تدبیر غالب آگئی۔

کہنے والے ایسی عجیب بات کیوں کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اس کا سبب خود تشکیلِ پاکستان میں ہو سکتا ہے۔ اور جب آدمی ایک غلطی کو نہ مانے تو اپنی غلطی کو درست کرنے کے لیے وہ مزید ایسی غلطیاں کرتا ہے جو پہلے سے بھی زیادہ غیر معقول ہوتی ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر کی قبر یروشلم میں مسجد اقصیٰ کے قریب ہے۔ مولانا محمد علی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ بیمار تھے۔ چنانچہ لندن کے ایک

ہوٹل میں ۴ جنوری ۱۹۳۱ کو ان کا انتقال ہوگیا۔ ہالی ڈے پارک (محمد علی پارک) میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ پھر سمندری جہاز کے ذریعہ ان کی میت لندن سے یروشلم لائی گئی جو کہ ایک تابوت میں بند تھی۔ جب ان کی میت پورٹ سعید پہنچی تو مصر کے وزیر اعظم آئے اور میت کو مسجد عباس میں لے گئے۔ وہاں دوبارہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ شہزادہ محمد علی نے غلافِ کعبہ کا ایک ٹکڑا تابوت پر رکھا۔ اس کے بعد جب میت یروشلم پہنچی تو جنازہ میں تقریباً دو لاکھ آدمی شریک تھے۔ مفتی اعظم آگے آگے چل رہے تھے۔ مسجد اقصیٰ پہنچ کر جنازہ کی آخری نماز ادا کی گئی۔ مولانا محمد علی کی سوانح عمری میں یہ الفاظ درج ہیں: "اولین قبلہ اسلام کا سینہ پھٹ گیا اور وہ اس میں سما گیا۔ ان کے جسد خاکی کی آخری آرام گاہ وہ ارض قدس ہوئی جس کو قرآن نے (الذی بارکنا حولہ کہا ہے" اس تدفین پر اقبال نے کہا:

سوے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

قرآن میں ہے کہ لقد انزلنا الیکم کتابا فیہ ذکرکم (الانبیاء ۱۰) اس کی تشریح سہل بن عبداللہ نے یہ کی ہے کہ ہم نے تمہارے اوپر قرآن اتارا۔ اس میں وہ عمل بتایا گیا ہے جس میں تمہارے لیے زندگی ہے (العمل بما فیہ حیاتکم) القرطبی ۲۷۳/۱۱

ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس آیت کے مطابق، یقیناً فلسطین کے مسئلہ کا حل بھی قرآن میں مذکور ہونا چاہیے۔ پھر میں نے کہا کہ اس معاملہ میں واضح رہنمائی قرآن میں موجود ہے، اور وہ یہ آیت ہے: ان یمسسکم قرح فقد مس القوم قرح مثلہ وتلک الایام نداولھا بین الناس (آل عمران ۱۴۰)

اس آیت میں اسلامی تاریخ کے اس واقعہ کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ کو بدر کے دن مشرکوں کے اوپر غالب کیا۔ اس کے بعد احد کے دن اللہ نے ان کے دشمنوں کو ان کے اوپر غلبہ دے دیا (اظھر اللہ عز وجل نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ علی المشرکین یوم بدر و اظھر علیھم عدوھم یوم احد) تفسیر الطبری ۱۰۵/۴

اس وقت مسلمانوں میں غم اور مایوسی کے جذبات پیدا ہوئے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے کہا گیا کہ آخرت کی نعمتیں تو صرف اہل ایمان کے لیے ہیں۔ مگر دنیا کا نظام امتحان اور

آزمائش کے اصول پر قائم کیا گیا ہے۔ اس لیے یہاں غلبہ اور مغلوبیت کا تجربہ باری باری ہر ایک کو کرایا جائے گا، تاکہ ہر ایک کی ہر پہلو سے آزمائش ہو سکے (تلك الايام نداولها بين الناس)

یہی بات ایک فارسی شاعر نے ان الفاظ میں کہی ہے کہ —— دانش مند چڑیا جب جال میں پھنس جائے تو اس کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے:

مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

تحمل کا مطلب سپر اندازی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جذباتی ردعمل سے بچ کر صابرانہ منصوبہ بندی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں تمام مسلم دانشور اور رہنما فلسطین کی بازیابی کے مسئلہ کو ملت مسلمہ کا مسئلہ نمبر ایک بتاتے ہیں۔ مگر عین اسی وقت تمام دنیا کے مسلمان باہمی لڑائیوں میں اپنی بہترین طاقت ضائع کر رہے ہیں۔ اس میں متشددانہ جنگ اور غیر متشددانہ جنگ دونوں شامل ہیں۔ مزید ستم یہ ہے کہ ہر ایک اپنے کو خادمِ دین اور مجاہدِ اسلام سمجھ رہا ہے۔

ایران اور عراق دونوں مسلسل فلسطین کے خلاف پر شور بیان دیتے رہتے ہیں۔ مگر دونوں آٹھ سال (۱۹۸۰-۱۹۸۸) تک خوں ریز قسم کی باہمی لڑائی لڑتے رہے۔ اس جنگ کے زمانہ کے ایرانی لیڈر آیت اللہ خمینی کے حامی کہا کرتے تھے کہ قدس کا راستہ بغداد ہو کر جاتا ہے (الطريق الى القدس يمرُّ ببغداد) عین اسی وقت عراقی لیڈر صدام حسین کے حامی بلند بانگ طور پر یہ کہتے تھے کہ قدس کا راستہ تہران ہو کر جاتا ہے (الطريق الى القدس يمرُّ بطهران) دوبارہ صدام حسین نے ۱۹۹۰ میں کویت پر فوج کشی کر دی۔ اب صدام حسین کے حامی یہ کہنے لگے کہ قدس کا راستہ کویت ہو کر جاتا ہے (الطريق الى القدس يمرُّ بالكويت)

اس قسم کے الفاظ فلسطین کے مسئلہ سے دل چسپی کا ثبوت نہیں ہیں۔ بلکہ صرف مسلم رہ نماؤں کی استحصالی ذہنیت کا ثبوت ہیں۔ یہ صرف ان کے جرم میں اضافہ کرتے ہیں، وہ ان کو کسی انعام کا مستحق نہیں بناتے۔

۳۱ اگست ۱۹۹۵ کی شام کو واپسی ہوئی۔ یروشلم سے تل ابیب تک کا راستہ

بذریعہ کار طے ہوا۔ تل ابیب سے ال آل کی فلائٹ ۸۱ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔

تل ابیب پہنچ کر پہلے ہم لوگ شہر میں گئے۔ میں چاہتا تھا کہ تل ابیب پر ایک طائرانہ نظر ڈال لوں۔ یہ ایک ماڈرن شہر ہے۔ یہ میڈیٹرینین کے کنارے واقع ہے اور اسرائیل کا سب سے بڑا شہری مرکز ہے۔ یہ ایک قدیم بستی کو ترقی دے کر ۱۹۵۰ میں بسایا گیا ہے۔ تل ابیب اور حیفہ اور یروشلم میں اسرائیلی آبادی کا تقریباً ۵۵ فی صد حصہ رہتا ہے۔

ایل آل کی ایر ہاسٹس اخبارات لے آئی۔ یہ انگریزی اور عبرانی کے اخبارات تھے۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے اسرائیلی تاجر نے عبرانی اخبار لیا۔ اس تقریب سے ان سے عبرانی زبان کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ اسرائیل میں سب سے بڑا عبرانی اخبار ایودت (Y'edio) ہے۔ اس کے معنی ہیں تازہ خبریں۔ اس کے بعد نمبر ۲ کا اخبار ماریو (Maariv) ہے۔ عبرانی زبان دائیں سے بائیں کی طرف لکھی جاتی ہے۔ اس کے طرزِ تحریر کا ایک نمونہ یہ ہے :

חברת אל על שמחה להציג בפניכם תרגילי "התעמלות כסא", שנועדו לשפר את הרגשתכם בזמן הטיסה את התרגילים, המיועדים לאנשים בריאים, מומלץ לבצע מספר פעמים במשך הטיסה (5-8 פעמים כל תרגיל בקצב איטי). את התרגיל האחרון רצוי לבצע כשעה לפני הנחיתה. אין להתעמל מיד לאחר הארוחה, אלא כשעה וחצי אחריה. תרגילים 1, 2, 3, ו-7 יש לבצע לשני הצדדים. תיהנו!

مذکورہ تاجر سے میں نے پوچھا کہ عبرانی تو ایک مردہ زبان تھی۔ پھر اتنی کم مدت میں وہ اسرائیل کی ایک زندہ قومی زبان کس طرح بن گئی۔ اس نے کہا کہ عبرانی اگرچہ ہمارے یہاں عام استعمال میں نہیں تھی۔ مگر عام طور پر لوگ عبرانی کو سمجھتے تھے۔ کیوں کہ دعا اور عبادت میں وہ اس کو روزانہ استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ جب اس کو قومی زبان بنانے کا فیصلہ کیا گیا تو آسانی سے عبرانی زبان قومی زبان کے طور پر رائج ہو گئی۔ اور یہ صرف ایک شخص کی کوششوں سے ہوا۔

پاکستان میں کچھ رہنماؤں نے چاہا کہ عربی زبان وہاں کی قومی زبان بن جائے۔ مگر وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ حالاں کہ پاکستان میں بھی تمام مسلمان عربی کو دعا اور عبادت کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ یہودیوں کو صرف عبرانی کے الفاظ نہیں رٹائے جاتے تھے بلکہ اس کا مطلب بھی انھیں پڑھایا گیا تھا۔ پاکستان کے مسلمانوں کو صرف عربی کے الفاظ یاد کرائے گئے تھے، اس کے مفہوم سے وہ ناآشنا تھے۔

دوران پرواز اسرائیلی ایرلائنز (El Al) کا میگزین بابت جولائی - اگست ۱۹۹۵ دیکھا۔ اس میں کثرت سے مکانات کے اشتہارات تھے۔ مختلف کمپنیوں کے بنائے ہوئے مکانات کی خوب صورت تصویریں، اور ان کے نیچے اس طرح کے خوش کن الفاظ لکھے ہوئے تھے :

Your dream home in Israel

یا یہ کہ اس خوب صورت کامپلکس میں اپنے لیے ایک اپارٹمنٹ حاصل کیجئے اور دنیا کی جنت میں رہنے کا لطف اٹھائیے۔ میں نے ایک اسرائیلی مسافر کو یہ اشتہارات دکھا کر اس کا تاثر پوچھا۔ اس نے کہا کہ ہم نے خوب صورت قسم کے رہائشی مکانات تو ضرور بنا لیے ہیں۔ مگر ایک نامعلوم خوف ہر یہودی کے دماغ میں ہوتا ہے کہ کیا معلوم، کب کہاں ایک بم پھٹ جائے۔

میں نے سوچا کہ موجودہ دنیا میں پرمسرت زندگی ممکن ہی نہیں۔ یہاں ہر حال میں کوئی نہ کوئی حزن لگا رہتا ہے۔ اس لیے حقیقی معنوں میں پرمسرت زندگی صرف آخرت کی جنت ہی میں ممکن ہے۔ جہاں خدا اپنی برتر طاقت سے حزن کو حذف کر دے گا ــــ (اذھب عنا الحزن (فاطر ۳۴)

بمبئی ایرپورٹ پر مسز سوزن جیکب (Ms Susan Jacob) نے پریشان کیا تھا۔ اس کے بعد اسرائیلی کمپنی کا ایک نوجوان آیا۔ اس نے اپنا نام نیویل مستری (Naville Mistry) بتایا۔ اس نے مزید بتایا کہ اس کا باپ پارسی ہے اور اس کی ماں کیتھولک عیسائی ہے، ماں کے اثر سے لڑکا بھی عیسائی ہو گیا ہے۔ اس نوجوان نے ایرپورٹ پر میری رہنمائی کی۔ اس نے میرا بیگ اصرار کر کے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مجھ کو آخری گیٹ تک پہنچایا۔

سفر سے واپسی کے بعد مولانا انیس لقمان ندوی کا خط (۸ جولائی ۱۹۹۶) ملا۔ وہ آجکل ابوظبی میں مقیم ہیں۔ یہ خط فلسطین کے مسئلہ سے متعلق ہے اس لیے اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے :

ابوظبی میں قیام کے دوران پچھلے چھ مہینوں میں سو سے زیادہ عربوں سے ملاقات ہوئی۔ جن میں مقامی باشندوں کے علاوہ مصر، فلسطین، شام اور دیگر ملکوں سے آئے ہوئے (وافدین) بھی شامل ہیں۔ ان کے ساتھ جن موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی ان میں مسئلہ فلسطین سرفہرست ہے۔ جس شخص نے بھی عربی جرائد و مجلات اور عالم عرب میں چھپنے والی جدید کتابوں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ فلسطین پر یہود کا قبضہ عرب دنیا کا واحد سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

اب تک میرا احساس یہ تھا کہ قبلۂ اول (بیت المقدس) کو اسلام میں جو مقام حاصل ہے اس نے فلسطین کو اتنا زیادہ اہم اور سنگین مسئلہ بنا دیا ہے۔ بلکہ فلسطین کے مسئلہ پر بولنے اور لکھنے والا ہر شخص خواہ وہ عرب ہو یا غیر عرب عام طور پر یہی سمجھتا ہے کہ آزادیٔ فلسطین کے لیے عربوں کے مجاہدانہ جوش و خروش کا اصل محرک دینی اور اسلامی ہے۔ مگر عربوں کے ساتھ رہنے اور قریب سے ان کی نفسیات اور مزاج کا تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ "جہادِ فلسطین" کا حقیقی محرک دینی حمیت یا اسلامی غیرت سے زیادہ عربوں کی قومی نخوت اور نسلی تفاخر ہے۔

مسئلۂ فلسطین غالباً واحد مسئلہ ہے جس کے بارہ میں عرب دنیا کا تقریباً ہر شخص حساس ہے۔ بلکہ یہی ایک معاملہ ایسا ہے جس میں وہاں کا سیکولر اور اسلام پسند طبقہ دونوں ایک دوسرے کا ہمنوا ہے حالاں کہ دوسرے تمام معاملات میں ان کا حال یہ ہے کہ پہلا گروہ دوسرے کو انتہا پسندی اور دہشت گردی کا الزام دیتا ہے تو دوسرا گروہ پہلے کو کافر اور ملحد قرار دیتا ہے۔ اگر آزادیٔ فلسطین کا اصل محرک اسلامی غیرت و حمیت کو قرار دیا جائے تو پھر اس واقعہ کی توجیہہ ناممکن ہو جاتی ہے کہ کیوں ایسے لوگ ہی اس "جہاد" میں اسلام پسندوں کے شانہ بشانہ شریک ہیں جنھیں یہ کافر اور ملحد سمجھتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حسن البنا، اور شاہ فیصل کی طرح عرب حکام اور عوام دونوں کے درمیان ایک تعداد ایسے افراد کی پائی جاتی ہے جن کے لیے فلسطین پر یہودی قبضہ ان کی دینی غیرت کو چیلنج ہے اور فلسطین کی بازیابی کے لیے کوشش کرنا ایک اسلامی ذمہ داری۔ مگر عربوں کی اکثریت کے لیے یہ حقیقتہً عرب قومیت (العروبۃ) کو چیلنج کرنے کا مسئلہ ہے۔ یہ بات ان کے لیے حد درجہ ناقابل برداشت ہے کہ یہود، جو تعداد میں انتہائی قلیل ہیں اور سیکڑوں برس تک ان کے محکوم رہے ہیں، وہ ان کے اپنے ایک ملک پر اس طرح قابض ہو جائیں کہ بقیہ ممالک کے لیے ان کا وجود خطرہ بن جائے۔ عربوں کی قومی نخوت اس کا تحمل نہیں کر سکتی کہ وہ یہود کے مقابلہ میں پست ثابت ہوں یا یہود ان کے پڑوس میں ان کے ہم سطح اور ہمسر کی حیثیت سے آزادانہ زندگی گزاریں۔ ایک لفظ میں یہ کہ اصل مسئلہ یہودی نسل پرستی (صہیونیت) کے

بالمقابل عرب قومیت (العروبۃ) کی بالادستی کے درمیان کش مکش کا مسئلہ ہے۔

چونکہ تقریباً ڈیڑھ ہزار برس تک یہود کے اوپر عرب کا غلبہ اور تسلط رہا ہے۔ اس صدی کے نصف اول تک عرب دنیا میں یہود کی حالت کم و بیش وہی تھی جو قرآن کے ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے کہ "حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون"، مگر جب حالات بدلے اور نئے دور میں طاقت اور غلبہ کے جدید وسائل کو بروقت استعمال کرکے یہود نے داخلی طور پر اپنے آپ کو مستحکم کر لیا۔ جب کہ عرب دنیا ایسا کرنے میں ناکام رہی۔ اور بالآخر یہود فلسطین کے اوپر قابض ہو کر عربوں کے لیے مستقل خطرہ بن گئے تو نہایت شدت کے ساتھ ان کے قومی جذبات بھڑک اٹھے۔ ذہنی اور نفسیاتی طور پر وہ سخت تناؤ اور جھنجلاہٹ اور احساس کمتری کا شکار ہو گئے۔ اسی جھنجلاہٹ اور احساس کمتری کو دور کرنے کے لیے وہ ایک طرف اپنے عظیم ماضی کا تذکرہ کرتے ہیں اور دوسری طرف یہود کو احفاد القردۃ والخنازیر (بندر اور خنزیر کی اولاد) اور اسی طرح کے دوسرے حقارت آمیز ناموں سے پکارتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ یہود کو اپنے ماضی کے آئینہ میں دیکھ کر یہ جھوٹی تسکین حاصل کرتے ہیں کہ ہمیں ان کے اوپر برتری اور بالادستی حاصل رہی ہے۔ مگر وہ اپنے حال کا تقابل یہود کے حال سے نہیں کرتے۔ کیوں کہ ایسا کرنے میں ان کے اندر جھنجلاہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ ان کی قومی نخوت اس واقعہ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ ان کی غفلت اور دوسروں کی زمانہ شناسی کے نتیجہ میں احفاد القردۃ والخنازیر کہیں براہ راست ان کے اوپر غالب ہیں اور کہیں بالواسطہ طور پر مسلّط ہیں۔

آج کل عرب دنیا کی اسلامی تنظیموں خصوصاً آزادیٔ فلسطین کے لیے سرگرم تنظیم حرکۃ المقاومۃ الاسلامیۃ (حماس) میں ایک نیا رجحان ابھر رہا ہے۔ وہ یہ کہ اس تنظیم کے افراد اپنے جسم پر بم باندھ کر دشمن کے کسی ٹھکانے یا کسی اہم سرکاری یا عسکری اہمیت کے حامل دفتر میں کود پڑتے ہیں، ان کے جسم سے بندھا بم جب پھٹتا ہے تو وہ خود تو ہلاک ہوتے ہی ہیں مگر اپنے ساتھ دشمن کے بھی بہت سے افراد اور املاک کو تباہ کر دیتے ہیں۔ عام آدمی اگر ایسا عمل کرے تو اسے خودکشی کہا جائے گا۔ مگر بعض مسلم علماء حماس کے اس عمل کو خودکشی (عملیۃ انتحاریۃ) کے

بجائے شہادت طلبی (عملیۃ استشھادیۃ) کہہ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں دکتور یوسف القرضاوی کا ایک مفصل مقالہ کویت کے ہفت روزہ المجتمع (۱۸ جون ۱۹۹۶، صفحات ۳۵-۳۴) میں چھپا ہے۔

مذکورہ مقالہ میں یوسف القرضاوی نے مختلف دلائل کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حماس کے نوجوانوں کا یہ اقدام شہادت طلبی کا عمل ہے نہ کہ خودکشی کا۔ کیوں کہ وہ دشمن کو خوف زدہ کرنے (ارھاب العدو) کی ایک جدید اور موثر تکنیک ہے۔ دوسرے یہ کہ ان نوجوانوں کا مقصد محض خدا کی رضا جوئی ہے اور اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف کسی کارروائی پر اگر کوئی اس طرح اپنے کو ہلاک کرتا ہے تو یہ لاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کا مصداق ہلاکت نہیں بلکہ شہادت ہے۔ جس طرح صحابہ کرام کے بارے میں آتا ہے کہ مختلف غزوات میں انھوں نے اپنے آپ کو دشمن کے نرغہ میں ڈال دیا اور بالآخر شہید ہو گئے۔

اس سلسلہ میں دو باتیں ملحوظ رکھنی چاہئیں۔ اولاً یہ کہ صحابہ وغیرہ نے بعض غزوات میں جو یہ کیا کہ میدانِ جنگ میں دیوانہ وار کود پڑے اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ انھوں نے ایسا میدان جنگ میں کیا۔ جہاں عملاً جنگ برپا تھی۔ نہ کہ ایسی جگہ جہاں دشمن کے علاوہ بھی بہت سے غیر متعلق لوگ موجود ہیں۔

دوسرے یہ کہ صحابہ نے اگرچہ شہادت کے شوق میں جاں بازی دکھائی۔ مگر اس جاں بازی میں جتنا ان کا لڑکر مر جانے کا امکان تھا اتنا ہی امکان اس بات کا بھی تھا کہ وہ لڑکر دشمن کو ماریں گے اور فتح یاب ہو کر لوٹیں گے۔ قرآن کے الفاظ میں وہ جب قتال کرتے تھے تو یا دشمن کو قتل کرتے تھے یا دشمن کے ہاتھوں قتل ہوتے تھے (فیقتلون ان یقتلون) گویا صحابہ کے اقدام میں احتمالی طور پر دو بہتر نتائج (احدی الحسنیین) پوشیدہ تھے۔ یعنی وہاں فتح اور شہادت دونوں کا پچاس پچاس فیصد امکان رہتا تھا۔ مگر اس کے برعکس حماس وغیرہ کے موجودہ اقدام کا نتیجہ یقینی موت ہے۔ ایسی صورت میں اس کو صحابہ کے جاں بازانہ اقدام کے مشابہ قرار دینا قیاس مع الفارق ہے۔ قرآن و حدیث اور آثارِ صحابہ میں اس بات کے حق میں کوئی دلیل موجود نہیں کہ جہاں پیشگی طور پر صد فی صد موت یقینی ہو ایسے موقع پر اقدام درست ہے۔

دوسری بات یہ کہ اسلام کا ایک متفق اصول یہ ہے کہ جہاد کے معاملہ میں مسلمانوں کی داخلی قوت اصل معیار ہے۔ اگر داخلی اعتبار سے مسلمان مستحکم ہیں تو جہاد کا اقدام کیا جائے گا اگر داخلی استحکام مطلوبہ معیار سے کم ہے تو اسی تناسب سے جہاد کے حکم میں تخفیف ہوجائے گی۔ ابتداءً اہلِ اسلام اپنے ایمان اور اللہ و رسولؐ کے ساتھ محبت و وفاداری میں بہت بڑھے ہوئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے سے دس گنی طاقت کے مقابلہ میں جہاد کا حکم دیا۔ مگر جب اس پہلو سے اہل اسلام کی صفوں میں کمزوری آگئی تو اللہ تعالیٰ نے اس میں تخفیف کردی اور صرف اپنے سے دوگنی قوت کے مقابلہ میں اقدام کی اجازت دی۔ یہ تخفیف اس گروہ کے لیے کی گئی جن کو صحابہ کہا جاتا ہے اور جو نبی آخر الزماںؐ کے ساتھ تھا۔ آج کوئی قائد یا گروہ یہ دعویٰ کرنے کی جسارت نہیں کرسکتا کہ وہ کسی بھی اعتبار سے پیغمبر یا آپ کے اصحاب سے زیادہ مستحکم اور طاقت ور ہے۔ چنانچہ آج مسلمانوں کے اوپر تخفیف کا اصول بدرجۂ اولیٰ منطبق ہوتا ہے (الـٰئن خفف عنکم ...)

۴ جون کو مغرب کی نماز کے بعد دو عرب طالب علموں سے ملاقات ہوئی۔ ایک کا نام محمد داؤد تھا جو فلسطین کے رہنے والے ہیں اور ابوظبی کے مدرسہ بن درید میں اول ثانوی میں پڑھتے ہیں۔ فون (459025) دوسرے کا نام عمّار مصطفےٰ تھا جو مدرسہ ربعی بن عامر، ابوظبی، میں زیر تعلیم ہیں۔ فون (458752) گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ وہ ابھی ابھی اپنا سالانہ امتحان دے کر فارغ ہوئے ہیں۔ اور اب ان کی گرمی کی چھٹیاں شروع ہوئی ہیں۔

میں نے کہا کہ اسکول کا امتحان تو معمولی امتحان ہوتا ہے اس کو چند ہفتوں یا مہینوں کی محنت کے ذریعہ پاس کیا جاسکتا ہے۔ مگر ایک بہت بڑے امتحان میں پوری عرب دنیا پچھلے پچاس برس سے مبتلا ہے لیکن ابھی تک وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکی۔ یہ امتحان فلسطین کو یہودی قبضہ سے آزاد کرانے کا مسئلہ ہے۔

پھر میں نے کہا کہ آپ لوگوں کا تعلق اس نسل سے ہے جسے اکیسویں صدی میں میدانِ عمل میں اترنا ہے۔ شاید آپ لوگ اس امتحان میں کامیاب ہوجائیں جس میں پچھلی تین نسلیں مسلسل ناکام ہوتی رہی ہیں۔ میں نے ان سے سوال کیا کہ فلسطین کو آزاد کرانے کے سلسلہ میں

آپ لوگوں کا کیا خیال ہے۔ اسے طاقت کے ذریعہ آزاد کرایا جاسکتا ہے یا دعوت کے ذریعہ
(ترٰی، کیف یُمکِنُ اَن تُحرَّرَ ارضُ فِلَسطِین، بالقُوَّۃ اَم بالدعوۃ ؟)

یہ سوال میں نے ایک کاغذ پر لکھ کر دونوں نوجوانوں کو دیا اور کہا کہ اس پر کم ازکم تین دن غور کرکے مجھے بذریعہ ڈاک تحریری یا بذریعہ ٹیلی فون زبانی اپنے جواب سے مطلع کرو۔ اور ہو سکے تو اس معاملہ میں اپنے والدین سے بھی مشورہ کرلو۔

تین دن بعد میں نے خود ان کے گھر فون کیا۔ داؤد کے والد نے کہا کہ اپنے لڑکے کو میں نے امتحان کے زمانے میں بھی اتنا سنجیدہ غوروفکر اور مطالعہ میں غرق نہیں پایا جتنا وہ پچھلے تین روز سے آپ کے سوال کا جواب تیار کرنے میں محو ہیں۔ انھوں نے بڑا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ چھٹیوں میں ہم اپنے بچوں کو کوئی بامعنی سرگرمی یا کام نہیں دے پاتے۔ آپ نے بڑا اچھا کیا کہ ان کے خالی اوقات کو ایک بامعنی سرگرمی سے پر کر دیا (لقد اَحسَنتَ اِذمَلأتَ فرَاغَھم بِنَشَاطٍ ھادِفٍ)

اس کے بعد داؤد سے براہِ راست گفتگو ہوئی۔ وہ اپنا اور اپنے ساتھی عمار کا مشترک جواب مجھے فون پر پڑھ کر سنا رہے تھے۔ ان کے تفصیلی جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ سرزمین فلسطین کو یہود کے جابرانہ قبضہ سے طاقت کے سوا کسی اور ذریعہ سے آزاد نہیں کرایا جاسکتا۔ ہم نہیں سمجھتے کہ دعوت طاقت کی متبادل یا قائم مقام ہوسکتی ہے (لا یُمکنُ تحریرُ ارضِ فلسطین مِن الاحتلالِ الیَھُودِیّ الغَاشِمِ اِلا بالقوۃ، ولا نظُنّ اَنّ الدَّعوَۃ یُمکِنُ اَن تَکُونَ بَدِیلاً عَنِ القُوَّۃ اَو اَن تَحِلَّ مَحَلَّھَا)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان ابھی تک دعوت کی تسخیری طاقت کا راز دریافت نہیں کر سکے ہیں۔ حالاں کہ تاریخ میں اسلام کی تمام عظیم فتوحات کا دروازہ دعوت ہی کے ذریعہ کھلا ہے۔ اگر اکیسویں صدی میں فلسطین اور اس جیسے دوسرے ملی اور عالمی مسائل کو حل کرنا ہے تو جدید مسلم نسل میں صحیح دعوتی شعور پیدا کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر ہمارے مسائل آئندہ کئی صدیوں میں بھی غیر حل شدہ پڑے رہیں گے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 90	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs. 170	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs. 250	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs. 400	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	